نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۴۱	فہرست مضامین مئی سنہ ۴۲ء	شمار ۵

لاحظات ---------- ۲
قتیل کا وطن ------- سید اسد علی انوری فرید آبادی --- ۵
جاپان کے خوفناک ارادے ---------- ۱۱
سوچ (ایک نفسیاتی مطالعہ) --- مجتبیٰ حسین ------ ۱۴
سیماب صاحب اور شیطان ---- الحق ---------- ۱۸
پورب اور پچھم ـ دو ہواؤں کا تصادم ---- محمد عتیق صدیقی ---- ۲۳
باب الاستفسار ---------- ۳۲
مطبوعات موصولہ ---------- ۳۵
منظومات ----- اثر - جمال - ماہر ---------- ۳۷

ضروری اعلان

میں پہلی مئی کو نینی تال پہونچ جاؤں گا اور ۲۶ مئی تک وہیں رہوں گا۔ چونکہ دفتر کا ایک حصہ میرے ساتھ ہوگا، اس لئے اگر اس زمانہ میں براہ راست نینی تال کے پتہ سے خط و کتابت کی گئی تو تعمیل نسبتاً جلد ہو سکے گی ـــ جو ڈاک لکھنؤ کے پتہ سے آئے گی وہ بھی ریڈائرکٹ ہو کر میرے پاس وہیں پہونچے گی لیکن ظاہر ہے کہ اس کی تعمیل میں اور زیادہ دیر ہو گی۔

(۲) جون کا پرچہ غالباً ۱۵ یا ۲۰ جون تک شایع ہوگا، اس لئے ۲۵ جون سے پہلے پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت نہ کی جائے۔ جولائی کا نگار اپنے وقت سے نکلے گا۔ نینی تال کا پتہ: "ہمالیہ ہوٹل" ہوگا

نیاز فتحپوری

ملاحظات

حالات جنگ

گردش اور مدوجزر، کائنات کے نظام اور مظاہر قدرت کا اصل اُصول ہے، کسی ایک نقطہ پر کسی چیز کو سکون نہیں ہے۔ اس لئے ہم یہ تو کہہ ہی نہیں سکتے کہ لڑائی میں ٹھہراؤ پیدا ہوگیا ہے، لیکن کچھ عرصہ تک ایک ہی قسم کی خبریں سننے کے بعد ہم ایسا محسوس کرنے لگتے ہیں کہ لڑائی ایک جگہ ٹھہر کر رہ گئی ہے، حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔

سنگاپور کے فوراً بعد ہی رنگون پر جاپانی قبضہ نے لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقعہ دیا تھا کہ جاپانی فوجوں کی رفتار غالباً یہی رہے گی اور برما کی لڑائی چند دن میں ختم ہوجائے گی، اسی طرح روس کے محاذ پر بھی یہی یقین تھا کہ موسم بہار شروع ہوتے ہی، نازی فوجیں اپنی پیشقدمی زور شور سے شروع کردیں گی، لیکن نہ اب تک برما کی لڑائی ختم ہوئی، نہ ہٹلر نے روس کی طرف کوئی خاص جارحانہ قدم اُٹھایا — مگر اس سے کوئی مختتم نتیجہ نکالنا غلطی ہوگی

اس میں شک نہیں کہ محوری طاقتوں کے مقابلہ میں جمہوری قوتوں کا پلہ اپنی طیاریوں کے لحاظ سے بھاری ہوتا جارہا ہے، لیکن اگر جرمنی اور جاپان دونوں کا جارحانہ پہلو، مدافعت میں تبدیل ہوجائے، تو بھی اس وقت تک وہ اتنا حاصل کرچکے ہیں کہ اس کے واپس لینے کے لئے وقت، روپیہ اور جان کا زبردست خراج ادا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ جنگ کا ہر وقفہ، اس کی طوالت اور گتھیوں میں اضافہ کرتا جارہا ہے، اور مشکل ہی سے وقت یا نتیجہ کی تعیین کی جاسکتی ہے

اس وقت بظاہر لڑائی کے صرف تین محاذ نظر آتے ہیں ایک بحرِ اوقیانوس، دوسرا روس اور تیسرا ایشیا، لیکن سچ پوچھئے تو ساری دنیا اس سے کسی نہ کسی طرح متاثر ہورہی ہے۔ اگر کسی قطعۂ زمین کو یہ آگ خاک سیاہ کرچکی ہے، تو دوسری جگہ اس کی لپٹیں پہونچ رہی ہیں، اگر کہیں اس کا صرف دھواں نظر آتا ہے، تو دوسری جگہ اس کی گرمی محسوس کی جارہی ہے، الغرض اسوقت کوئی ملک ایسا نہیں، جو اس خطرہ سے دور ہو

ساحل مدراس پر، وزیاگپٹم اور کوکوناڈا میں جاپانی ہوابازوں نے جو بم گرائے ہیں، ان سے یہ بات ظاہر ہوچکی ہے کہ جاپان کا آیندہ اقدام ہندوستان ہی کی طرف ہونے والا ہے، اور جس خطرہ کا اندیشہ تھا وہ ہمارے سامنے ہے

سنگاپور، جنوبی برما اور جزایر جاوا و سماترا پر جاپانی قبضہ نے دشمن کے لئے خلیج بنگال کا راستہ بڑی حد تک صاف کردیا ہے، چنانچہ اس نے جزائر انڈمان ونکوبار میں بھی اپنی فوجیں اُتار دی ہیں اور اس سلسلہ کی صرف ایک کڑی سیلون ایسی رہ گئی ہے کہ اگر وہ بھی دشمن کے ہاتھ آجائے تو پھر خلیج بنگال میں اسکی نقل و حرکت بالکل آزاد ہوجاتی ہے۔ چنانچہ اسی غرض سے اس نے سیلون پر دو بار ہوائی حملے کئے۔ ہر چند وہاں اسے ہر مرتبہ کافی نقصان اُٹھانا پڑا، لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ یہ خطرہ ختم ہوچکا ہے

اس میں کلام نہیں کہ جاپان کی اسکیم، خلیج فارس اور مشرق وسطیٰ کے سواحل تک اپنا اثر قایم کرنا ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے اسے نہ صرف سیلون بلکہ ہندوستان کے بعض ساحلی مقامات پر بھی گھیرا ڈالنا ضروری ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا آغاز کب ہو

شمالی برما کی طرف جاپانی اقدام کی وہ رفتار بیشک نہیں ہے جو اس سے قبل ملایا یا جنوبی برما میں پائی جاتی، لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہے اور پیٹرولی چشموں کے مرکز سخت خطرہ میں ہیں

اب اسی کے ساتھ آپ جرمنی کو لیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ روس میں اسے وہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی جس کی اسے توقع تھی اور نازی نقصان کی فہرست اب اس حد تک پہونچ چکی ہے کہ ہٹلر کوئی دوسرا جارحانہ قدم اُٹھاتے ہوئے ہچکچاتا ہے، لیکن صورتیں کچھ ایسی ہیں کہ اسے بغیر لڑے چارہ بھی نہیں ہے۔ اسلئے

اگر وہ ماسکو و لینن گراڈ کی طرف نہ بڑھا تو جنوبی روس کی طرف بڑھنا اس کے لئے ناگزیر ہے کیونکہ لڑائی جاری رکھنے کے لئے اس وقت سب سے بڑا سوال پٹرول کا ہے اور عراق و باکو کے پٹرولی چشموں تک پہونچنے کے لئے وہ اپنی ساری کوششیں صرف کردے گا، اس سلسلہ میں قدرتاً ترکی کا سوال بھی سامنے آجاتا ہے، کیونکہ بلغاریا کی طرف سے نازی فوجوں کا راستہ ترکی ہو کر ہے اور اقرار و انکار دونوں صورتوں میں اس کو میدان جنگ بننا ضروری ہے

کہا جاتا ہے کہ جس وقت جرمنی کا یہ نیا حملہ شروع ہوگا تو جاپان بھی سائبیریا کی طرف سے روس پر حملہ کرے گا، تاکہ روس کی قوت منتشر ہو جائے اور چونکہ روشی حکومت اب موسیولاوال کے ہاتھوں میں ہے جو نازیوں کا طرفدار ہے، اس لئے یقین کیا جاتا ہے کہ ہٹلر فرانس کی بحری قوت اور اس کے دوسرے ذرائع سے فایدہ اٹھا کر براہ لیبیا، اسکندریہ اور نہر سویز تک پہونچنے کی کوشش کرے گا

یہ ہے اُن خطرات کی فہرست جو برطانیہ اور اس کی ساتھی حکومتوں کے سامنے ہیں۔ اب آیئے علٰحدہ علٰحدہ ان میں سے ہر ایک پر غور کریں کہ ان کی اہمیت کیا ہے اور ان کے خلاف کیا کیا امکانات پائے جاتے ہیں

ہندوستان اور برما

جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا، ہندوستان پر حملہ کرنا یقیناً جاپان کی اسکیم میں شامل ہے، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اس میں آسانی سے کامیاب ہوسکے گا۔ حملۂ ہندوستان کی ایک غرض تو یہ ہوسکتی ہے کہ سارے ملک پر قبضہ کیا جائے اور دوسری یہ کہ ساحلی مقامات پر یا ساحل سے قریب تر دوسرے مقامات پر قبضہ کرکے نہ صرف خلیج بنگال بلکہ سارے بحر ہند میں رنگون سے لیکر مڈگاسکر اور نہر سویز تک راستہ صاف کرلیا جائے۔

اول صورت کی کامیابی کے امکانات بہت ضعیف ہیں۔ کیونکہ ہندوستان ایسے طویل و عریض ملک پر تسلط قایم کرنے کے لئے اتنی طویل مہم کی ضرورت ہے کہ شاید جاپان کی عمر اس کے لئے وفا نہ کرے۔ اگر اس نے صرف خشکی کی طرف سے بڑھنے کا ارادہ کیا تو پہلے اسے برما فتح کرنا ہوگا اور شمالی برما میں جنگ کی موجودہ رفتار جاپان کے حق میں اتنی سست ہے کہ قلب ہندوستان تک پہونچنے کے لئے اسے طویل زمانہ درکار ہوگا، اور اگر ہم ان مدافعانہ تدابیر کو بھی سامنے رکھیں جو روز بروز برطانیہ کی طرف سے زیادہ استحکام کے ساتھ اختیار کی جارہی ہیں اور امریکہ کے اس وعدۂ امداد پر بھروسہ رکھیں جس کا مسٹر روز ویلٹ نے حال ہی میں اعلان کیا ہے، تو پھر یہ بات مشکل ہی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جاپان ہندوستان پر قبضہ کرنے میں کبھی کامیاب ہوسکتا ہے

جاپان کو شاید یہ خیال بھی ہے کہ جس طرح برما کی آبادی نے اس کا ساتھ دیا ہے، ہندوستان کی آبادی بھی اسکی شریک ہوجائے گی، لیکن یہ خیال درست نہیں، کیونکہ برما کی آبادی نسلی و تمدنی مشارکت کی وجہ سے جاپان کی طرف مایل ہوسکتی تھی، مگر ہندوستان جو بہ لحاظ تہذیب و معاشرت، اخلاق و مذہب جاپان سے بالکل مختلف ہے، کبھی یہ جذبہ اپنے اندر پیدا نہیں کرسکتا، علی الخصوص ایسی صورت میں جبکہ وہ ملک آزادی سے کم کسی اور مفاہمت پر راضی ہو ہی نہیں سکتا اور جاپان کی بدنام امپریلزم سے وہ یوں بھی پوری طرح آگاہ ہے

اگر جاپان نے ہندوستان کا خیال ترک کرکے صرف ساحلی مقامات پر قناعت کرنا چاہی تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اسے زیادہ تر بحری و ہوائی قوت سے کام لینا پڑے گا، لیکن چونکہ اسے بحر پاسفک میں بھی اپنی موجودہ پوزیشن کو قایم رکھنا ہے اور ایک مہینہ کے بعد بارش کا موسم جہازوں کی نقل و حرکت کو دشوار بنادے گا، اسلئے جاپان غالباً اس میں کامیاب نہیں ہوسکتا کہ ایک طرف وہ اپنے مقبوضات پاسفک سمندر کو بھی ہاتھ سے نہ نکلنے دے، اور دوسری طرف وہ کلکتہ، مدراس اور سیلون سے لیکر افریقہ اور مشرق وسطی کے ساحلوں تک اپنا اقتدار قایم کرے۔ امریکہ جس تیزی کے ساتھ اپنی بحری اور ہوائی طاقت بڑھا رہا ہے، وہ جاپان کے لئے ایک علٰحدہ مستقل خطرہ ہے جو اسے کبھی اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ خود اپنے ملک کی طرف سے مطمئن ہوکر دور دراز سمندروں میں قسمت آزمائی کرتا پھرے۔

جاپان اور روس

بعض کا خیال ہے کہ جاپان سائبیریا کی طرف سے روس پر حملہ کرے گا۔ اول تو یوں بھی اس کا امکان بہت ضعیف ہے، کیونکہ جاپان مشکل ہی سے اپنے آپ کو اس خطرہ میں ڈال سکتا ہے کہ ایک طرف وہ بحر ہند و بحر پاسفک میں بھی اپنی مہم جاری رکھے اور دوسری طرف روس پر بھی حملہ کردے۔ اس کا موجودہ بحری محاذ کیا کم ہے کہ وہ روس ایسی زبردست قوت کی دشمنی مول لیکر خشکی کا دوسرا طویل محاذ قایم کرے ——

لیکن اگر اس نے ایسا کیا بھی تو کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے

سوویٹ حکومت ۳۳ء سے مشرق و مغرب دونوں محاذوں پر جنگ کرنے کی طیاریاں کر رہی ہے اور سائبیریا کی طرف اس کی فوجوں کی توں محفوظ ہے تیسری پنج سالہ اسکیم کی رو سے سائبیریا کا ریگ زار، ایک نہایت اچھے زرخیز خطہ میں تبدیل ہوگیا ہے، اور وہاں کی زرعی و صنعتی پیداوار اتنی کافی ہوگئی ہے کہ

سوویٹ حکومت اپنے مغربی محاذ کو نقصان پہونچائے بغیر مشرق میں جاپان کو برسوں اُلجھائے رکھ سکتی ہے

یہ درست ہے کہ اوکرائن اور سفید روس کا علاقہ نکل جانے کی وجہ سے مغربی حصۂ ملک کی پیداوار سے وہ بڑی حد تک محروم ہوگیا ہے، لیکن سوویٹ حکومت کی ریڑھ کی ہڈی نہ اوکرائن ہے، نہ سفید روس، نہ ماسکو ہے، نہ لینن گراڈ بلکہ یورال پہاڑوں کا وہ سلسلہ ہے جو شمال سے لیکر جنوب میں سرحد ایران تک چلا گیا ہے۔

ان پہاڑوں میں سوویٹ حکومت کے اتنے ذخیرے جمع ہیں اور آلات حرب بنانے کے اتنے کارخانے پائے جاتے ہیں کہ مغرب کی طرف اگر اس کا سارا علاقہ ہاتھ سے نکل جائے، تو بھی وہ برسوں جاپان اور جرمنی دونوں سے جنگ کرسکتا ہے۔ اس لئے میں نہیں سمجھ سکتا کہ جاپان روس پر حملہ کرنے کی حماقت کرسکتا ہے

روس اور جرمنی یہ ہم پہلے ظاہر کرچکے ہیں کہ جرمنی کی توقعات روس میں پوری نہیں ہوئیں۔ ہٹلر کو یقین تھا کہ جس وقت نازی فوجیں حدود روس میں داخل ہوں گی، وہاں انقلاب پیدا ہوجائے گا، لیکن اب اسے معلوم ہوا کہ سوویٹ حکومت سے وہاں کی رعایا بالکل مطمئن ہے اور اس لئے دوسرا حملہ اس کا بالکل دوسرے حالات کے تحت ہوگا

پہلے اس کے پاس فوج بھی زیادہ تھی اور پٹرول و دیگر سامان حرب بھی کافی تھا اور روسی رعایا کی طرف سے انقلاب کا خیال بھی اس کا معاون تھا۔ لیکن اب دس ماہ کے بعد جرمنی کی پوزیشن کچھ اور ہے۔ ۲۰ لاکھ سے زیادہ اس کی فوج ختم ہوچکی ہے اور پٹرول کی کمی رومانیا اور پولینڈ کے چشموں سے پوری نہیں ہوسکتی۔ دوسری طرف روسی فوج بھی نازی طریق جنگ سے واقف ہوچکی ہے اور اس کی ہمت بہ نسبت پہلے کے بہت بڑھی ہوئی ہے۔ پہلے ممکن ہے تذبذب کی حالت پائی جاتی ہو، لیکن اب روس کو اپنی کامیابی کا یقین ہے اور اس نے تاتسی جماعت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک کر ملک کی توقعات کو بہت بلند کردیا ہے اس لئے ہٹلر کا دوسرا حملہ اگر ہوا بھی تو اس کا زور زیادہ تر عراق اور باکو کی طرف ہوگا تاکہ وہ یہاں کا پٹرول حاصل کرکے جنگ کو کسی طرح جاری رکھ سکے۔

ابھی تک یہ حملہ شروع نہیں ہوا اور اس کی وجہ غالباً یہ رہی ہوگی کہ وہ فرانس کے مفتوحہ علاقہ کی طرف سے مطمئن نہیں تھا، یعنی اسے انگلستان کی طرف سے بھی حملہ کا اندیشہ تھا اور خود وشی حکومت پر بھی زیادہ اعتماد نہ کرسکتا تھا، لیکن اب کہ وشی حکومت لاوال کے ہاتھوں ہے، اسے اس سرحد کی طرف سے اطمینان ہوگیا ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہ روس اور لیبیا دونوں طرف حملہ شروع کرے، لیکن اگر یہ خبر صحیح ہے کہ وشی حکومت نے جرمنی کے استمزاج سے جاپان کے فوجی مشن کو ٹوکیو کا سکر آنے کی اجازت نہیں دی تو اس کے معنے یہ ہیں کہ مڈل ایسٹ اور افریقہ کی طرف جرمنی اور جاپان دونوں کا ملکر گھیرا ڈالنے کی اسکیم پوری ہوتی نظر نہیں آتی اور ہوسکتا ہے کہ اس کا اثر لیبیا کی جنگ پر بھی پڑے

جرمنی اور ترکی ترکی کے خطرات البتہ زیادہ قوی ہوتے جاتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنی غیر جانب داری کو کیونکر قایم رکھ سکتا ہے۔ اگر بلغاریا کی طرف سے جرمن فوجیں عراق کی طرف بڑھیں تو ترکی سے ہوکر گزرنا ناگزیر ہے اور چاہے وہ اجازت دے یا نہ دے ترکی کی سرزمین ایک سخت خونریز جنگ کا اکھاڑا بن جائے گی

ترکی کی آیندہ پالیسی کے متعلق کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی۔ میلان تو اس کا بڑی حد تک روس اور برطانیہ ہی کی طرف ہے، لیکن عین وقت پر اسکے مصالح کیا ہوں، کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے لئے جس طرح جرمنی کی دشمنی مول لینا دشوار ہے، بالکل اسی طرح برطانیہ کی مخالفت پر راضی ہونا مشکل ہے تاہم اسے کسی نہ کسی طرف ہونا پڑے گا اور اس میں شک نہیں کہ یہ وقت ترکی کے لئے بہت سخت ہوگا

خود ترکی میں تو اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ جرمنی کا مقابلہ کرسکے، لیکن برطانوی، امریکی اور روسی امداد سے وہ جرمنی کی راہ میں کافی مشکلات پیدا کرسکتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ مڈل ایسٹ میں بھی ہٹلر کو ویسے ہی ناخوشگوار تجربات کا مقابلہ کرنا پڑے جو روس کے محاذ پر اُسے حاصل ہوئے ہیں

امریکہ و برطانیہ الغرض خطرات جتنے زیادہ ہیں، اتنا ہی اطمینان بھی بڑھتا جاتا ہے۔ کیونکہ امریکہ کی ساری دولت، ساری قوت اور تمام ذرایع، روس و برطانیہ کے ساتھ ہیں اور جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے اتحادی طیاریاں بھی بڑھتی جارہی ہیں۔ جب لڑائی شروع ہوئی ہے تو جرمنی کے مقابلہ میں برطانوی قوت نصف سے بھی کم تھی، لیکن آج وہ برابر ہے اور ہر طلوع ہونے والے نئے دن کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا جارہا ہے اس لئے لڑائی جتنی بڑھتی جارہی ہے، اتحادی کامیابی کے امکانات بھی قوی ہوتے جارہے ہیں اور اگر سنہ ۴۲ء خیریت سے گزر گیا تو سنہ ۴۳ء کا مطلع غالباً گرد آلود نظر نہ آئے گا۔

قتیل کا وطن

مرزا محمد حسن قتیل کہاں کے رہنے والے تھے؟ یہ سوال اکثر اصحاب نے مجھ سے کیا ہے۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ وہ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ ایک اور صاحب کے نزدیک وہ لکھنوی ہیں۔ اصل میں یہ غلط فہمیاں اس لئے ہوئی ہیں کہ بعض تذکروں میں بلا تحقیق بعض باتیں لکھدی گئی ہیں۔ جن حضرات نے مختلف تذکروں کے بیانات کو جانچا تولا نہیں ہے بلکہ محض کسی ایک تذکرے کے دعوئے بے دلیل پر بھروسہ کرلیا ہے وہ اکثر اس مسئلہ میں بہک گئے ہیں۔

سب سے پہلے یہی دیکھنا چاہئے کہ مختلف تذکرے قتیل کے متعلق کیا لکھتے ہیں:-

۱- "عقد ثریا" از مصحفی

"مرزا محمد حسن قتیل۔ در اصل بزرگانش قوم کھتری بھنڈاری پٹالی بودہ اند۔ پدرش درگاہی مل نام داشت وخودش در آں زماں بہ دیوالی سنگھ موسوم بود۔ در ایامے کہ متعلقانش بجسب آبخور لفیض آباد رفتہ استقامت گرفتند بردست مرزا باقر شہید اصفہانی ہیژدہ سالہ بود کہ بشرف اسلام پیوستہ"

۲- "مخزن الغرائب" از احمد علی ہاشمی چار دوئم وسوئم۔ قلمی۔ کتب خانہ ریاست بھیکم پور۔ حبیب گنج۔

"مرزا محمد حسن المتخلص بہ قتیل سلمہ اللہ تعالیٰ از قوم کھتریست ..... دریں زماں عدیل ونظیر خود ندارد ..... سی سال است کہ فقیر با ایشاں فرط محبت واخلاص وارد وبسا اتفاق افتادہ کہ دریکجا بودہ ایم"

۳- "خلاصۃ الافکار" از ابوطالب اصفہانی۔ قلمی۔ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ

"دیگر محمد قتیل واو مردے وارستہ نیک نہاد۔ اصلش از کھتریانِ ساکن شاہجہاں آباد ..... بغایت تحریر ..... بہ عافیت وصحت بمعاشرت شاگرداں و دوستاں در بلدۂ لکھنؤ بسر می برد"

۴- "نتائج الافکار" از محمد قدرت اللہ گویاموی۔ قلمی کتب خانہ حبیب گنج۔ ریاست بھیکم پور۔

"نکتہ سنج بے عدیل مرزا محمد حسن قتیل کہ اصلش از لاہور است۔ در بدایت حال پدرش درگاہی مل از قوم کھتری معہ متعلقان بہ فیض آباد رفتہ استقامت گرفت۔ وے در عمر ہیژدہ سالگی بردست مرزا محمد باقر شہید بشرف اسلام مشرف شدہ ..... نظم شستہ وآبدارش مطبوع فصحائے بلاغت شعار ونیز نثر پختہ وپرکارش مرغوب نکتہ سنجان رنگین گفتار بالجملہ از شاہجہاں آباد رخت بکالپی کشید وچندے در آں جا بمصاحبت عماد الملک پسر امیر الامرا غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ بن نواب آصف جاہ بکمال خوبی وخرمی گزرانید وپس ازاں دل بساحت دار الحکومت لکھنؤ نہاد وتا آخر حیات ہماں جا بنہایت جمعیت خاطر بسر برد ..... آخر الامر اوائل عشرہ رابعہ ماہ ثالث عشر رخت بدار آخرت کشید"

۵- "شمع انجمن" از نواب صدیق حسن خاں صاحب

"مرزا محمد حسین قتیل بن درگاہی مل، قوم کھتری بود اصلش از لاہور است ..... سیر دہلی نمودہ بکالپی آمد ومصاحب عماد الملک گشت۔ بعدہٗ در لکھنؤ آمد وتا آخر حیات ہماں جا بنہایت جمعیت خاطر بسر برد ..... وفاتش در سنہ ۱۲۴۰ھ اتفاق افتاد"

۶- "گلشن مشتاق" از محمد حافظ علی مشتاق ملیح آبادی لکھنوی۔ قلمی۔

"قتیل۔ مرزا محمد حسن نام۔ از قوم کھتری است در عنفوان شباب مسلمان گشت۔ در انشا ونثر بے نظیر عصر خویش بود وفکر نظم ہم خوب نمود۔ از شاگردان مرزا محمد باقر کرمان شاہی شہید تخلص است۔ بتاریخ ۲۳ ربیع الاول روز شنبہ وقت سحر سن یک ہزار ودوصد وسی وسہ ہجری در دار السلطنت لکھنؤ قتیل خنجر اجل وکشتہ شمشیر فنا گردید"

۷ - "ریاض الفردوس" از مولوی محمد حسین شاہجہانپوری

"مرزا محمد حسین قتیل لکھنوی ہندو پسرے بود۔ بصحبت کسے از شیعانِ لکھنؤ مذہب تشیع اختیار کرد..... ایں بیت از دست سے

آفریں بر دلِ نرم تو کہ از بہرِ ثواب کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

۸ - "خوش معرکۂ زیبا" از سعادت خاں ناصر۔ قلمی۔ کتب خانہ پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی ادیب

"قتیل فخرِ فاخر مکیں یادگارِ علی حزیں۔ تصنیفات سے اس کی خاص و عام بہرہ ور نومسلم اور مسلم الثبوت مثل اس کے کمتر واسطے دریافت کرنے محاورات اہلِ زبان برسوں اصفہان میں رہا اور خوب دریافت کیا ۔۔۔۔۔"

۹ - غالب در کلکتہ ۱۲۴۳ھ

"میں دیوالی سنگھ فرید آباد کے کھتری کے قول کو نہیں مانتا"

۱۰ - "یادگارِ غالب" از خواجہ الطاف حسین صاحب حالی -

"(فٹ نوٹ) مرزا قتیل نومسلم تھے۔ اسلام لانے سے پہلے ان کا نام دیوالی سنگھ تھا۔ اور فرید آباد ضلع دہلی کے کھتری تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد لکھنؤ چلے گئے تھے۔ یہاں ان کی بہت قدر ہوئی۔

۱۱ - "قاموس المشاہیر"

"تخلص قتیل، مرزا محمد حسن نام ۔۔۔۔ وطن دہلی۔ اصلاً کھتری تھے اور بعد کو مذہب اسلام قبول کیا۔ فارسی اور اُردو دونوں میں شعر کہتے تھے ۔۔۔ دہلی سے لکھنؤ چلے آئے تھے۔ لکھنؤ میں بعہد نواب غازی الدین حیدر ۱۸۱۷ء مطابق ۱۲۳۳ھ انتقال کیا"

۱۲ - تاریخ اودھ از حکیم محمد نجم الغنی خاں صاحب۔ جلد چہارم صفحہ ۹۹

"مرزا محمد حسین قتیل جو پہلے ہندو مذہب فرید آباد کے کھتری تھے پھر مسلمان ہو گئے تھے۔ نظم و نثر میں اُستادی کے رتبہ کو پہونچ گئے تھے۔ قواعد فارسی وغیرہ کے بیان میں ان کے کئی چھوٹے چھوٹے رسالے اور ایک دیوان فارسی مشہور و معروف ہے۔ ۱۲۳۳ھ میں وفات پائی"

۱۳ - "لکھنؤ کی زبان" از سید محمد باقر شمس لکھنوی۔ مطبوعہ نگار مئی ۱۹۴۱ء

"یہاں صرف ان شعرا کے نام لکھے جاتے ہیں جو دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے ۔۔۔۔۔۔ (۱۹) مرزا محمد حسن قتیل"

ان کے علاوہ دو اور قلمی تذکروں کا حال مجھ تک پہونچا ہے لیکن میں نے وہ خود اپنی آنکھ سے نہیں دیکھے ہیں۔ گویا اس کی ذمہ داری نہیں لیجا سکتی کہ جو حال ان میں بتایا جاتا ہے وہ سب ویسا ہی ہو۔ یہ حسب ذیل ہیں:-

۱۴ - "شمع انجمن" از سید میر جان فرقتی دہلوی عظیم آبادی۔ قلمی - (یہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی "شمع انجمن" مطبوعہ سے بالکل الگ چیز ہے)

اس تذکرہ کا وجود ضرور ہے۔ جنوری ۱۹۰۵ء کے اُردوئے معلےٰ میں ایک مضمون مرزا احمد منشا پر جناب سید علی سجاد دہلوی عظیم آبادی نے حوالۂ قلم فرمایا تھا۔ مرزا منشا کے متعلق لکھا ہے کہ "تلامذۂ مرزا محمد حسن قتیل میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا"۔ مرزا منشا کی ایک غزل اور غالباً دیگر حالات بھی سجاد صاحب نے اسی تذکرہ شمع انجمن سے نقل کر کے لکھے ہیں۔ اس تذکرہ کے متعلق سجاد صاحب کہتے ہیں۔ "یہ تذکرہ زبان فارسی میں ہے اور مولوی سید امیر جان صاحب فرقتی دہلوی ساکن عظیم آباد کی تصنیف سے ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔ تذکرہ نگار راقم الحروف کے حقیقی چچا تھے جنھوں نے سالِ پیوستہ یہیں انتقال فرمایا"

لیکن جیسا میں عرض کر چکا ہوں یہ تذکرہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن اس کو بھی میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ میرے کرمفرما جناب مولوی ابوالکمال صاحب امید نے اسکو ۱۹۰۱ء میں بالاستیعاب دیکھا تھا۔ اور اپنی عادت کے مطابق اس کا اکثر حصہ قریب قریب حفظ کر لیا۔ امید صاحب فرماتے ہیں کہ اس تذکرہ میں قتیل کا ذکر بہت تفصیل سے تھا۔ وطن وغیرہ کے متعلق مولوی امید صاحب فرماتے ہیں کہ اس تذکرہ میں لکھا تھا کہ قتیل ۱۱۶۶ھ میں بمقام فرید آباد پیدا ہوئے اور ۶۷ سال کی عمر پاکر ۱۲۳۳ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔

۱۵ - دوسری کتاب جو میں نے نہیں دیکھی وہ ہے "بیاضِ یدِ بیضا" از مصحفی۔ قلمی۔ مشیر احمد صاحب علوی نے اس کا ذکر نگار کے مصحفی نمبر (جنوری ۱۹۳۹ء) میں کیا ہے۔ اور اس کو مصحفی کی غیر مطبوعہ بیاض فرمایا ہے۔ مشیر صاحب فرماتے ہیں کہ اس بیاض میں قتیل کا بھی ذکر اس طرح ہے کہ "ان کے بزرگ بٹالہ کے تھے۔ جب قتیل فیض آباد گئے تو مرزا باقر

اصفہانی کے ہاتھ پر ۱۸ سال کی عمر میں مسلمان ہوئے اور مرزا محمد حسن کے نام سے مشہور ہوئے۔ بعد کو امامیہ مذہب اختیار کیا۔ اور نواب سعادت علی خاں کے دربار میں باریابی ہوئی۔ ان کی فارسی دانی کی مصحفی نے بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ دریائے لطافت کی ترتیب میں یہ انشاء اللہ کے شریک تھے۔ کلام کا نمونہ نہیں دیا"

یہ ہے مرزا قتیل کے وطن کے متعلق دوسروں کی رائے جس تک میری پہونچ ہو سکی ہے۔

گویا ایک صاحب (صاحب تذکرہ ریاض الفردوس (۴)) قتیل کو لکھنوی بتاتے ہیں۔ یہ اگر اس نسبت سے نہیں لکھا گیا ہے کہ مرزا قتیل کی آخر عمر لکھنؤ میں گزری تو پھر یقیناً غلط ہے۔ صاحب تذکرہ یوں بھی کچھ زیادہ تحقیق کے طرفدار نہیں معلوم ہوتے۔ یہاں تک کہ جو شعر مرزا قتیل کا نمونہ میں دیا ہے۔ وہ بھی مرزا مرحوم کا نہیں ہے بلکہ حافظ کی مشہور غزل کا شعر ہے۔ بہرحال ریاض الفردوس کا بیان بے دلیل ہے۔ اور کسی جگہ سے مطلق یہ بات نہیں پائی جاتی کہ قتیل لکھنوی تھے۔

"اصلش از لاہور است" دو تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے۔ یعنی محمد قدرت اللہ صاحب گویاموی اور نواب صدیق حسن خاں صاحب۔ محمد قدرت اللہ صاحب کی "نتائج الافکار" (۴) کی تاریخ تالیف ۱۲۲۷ھ ہے۔ گویا یہ کتاب قتیل کے زمانہ حیات ہی میں لکھی گئی تھی۔ لیکن خود قتیل ہی کے حالات میں ان کی وفات تک کا ذکر ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب کی تالیف کا کام غالباً ۱۲۴۰ھ تک ہوتا رہا۔ یا بلکہ اس کے بھی بہت بعد تک۔ انتقال سے کچھ پہلے قتیل نے اپنی کتاب "ہفت تماشہ" تصنیف کی تھی جو منظر عام پر آچکی تھی۔ اس میں مرزا قتیل نے ہندوستان کی ذاتوں کا بالتفصیل ذکر کیا ہے اور کھتریوں کے متعلق لکھا ہے کہ کھتریوں کی اصل پنجاب ہے اور وہیں سے نکل نکل کر مختلف جگہ آباد ہوئے ہیں۔ ممکن ہے قدرت اللہ صاحب کی نظر سے یہ کتاب گزری ہو اور انھوں نے اس بیان کو خود قتیل ہی پر چپکا دیا ہو۔ "اصلش از لاہور است" کے یہ معنی مشکل ہی ہیں کہ خود قتیل یا ان کے باپ لاہور کے تھے۔ بلکہ اس فقرے سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوم یا قبیلہ کی اصل کی طرف اشارہ ہے۔ اس طرح کا بیان اکثروں کے متعلق ملے گا۔ بہت ایرانی الاصل تھے جن کی تین تین چار چار پشتیں ہندوستان میں گزر چکی تھیں آج بھی دلی میں محلے کے محلے ہزارہا اصحاب سے آباد ہیں جو "پنجابی" کہلاتے ہیں لیکن جن کی پشتیں صدیوں سے دلی میں رہ رہی ہیں۔ اور جن کو نہ ایک لفظ پنجابی کا آتا ہے نہ ان میں سے اکثریت کو یہ معلوم کہ وہ پنجاب کے کس حصہ سے کس زمانے میں آئے تھے۔ کشمیریوں کا حال تو اس معاملہ میں اور بھی اظہر من الشمس ہے۔ یہ اصحاب ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں صدیوں سے نہایت عزت کے ساتھ وہیں کے باشندے ہو کر رہ رہے ہیں لیکن سرشار اور چکبست کی لکھنویت اور کیفی کی دہلویت کے باوجود ان کو "کشمیری الاصل" لکھا جاتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ قدرت اللہ صاحب نے اسی معنی میں "اصلش از لاہور است" لکھا ہے۔ اسی لئے آگے چلکر جب تفصیل فرماتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "بالجملہ از شاہجہاں آباد رخت بکالپی کشید۔۔۔۔ پس ازاں دل بساحت دارالسلطنت لکھنؤ نہاد"

شمع انجمن (۵) میں نواب صدیق حسن خاں صاحب نے بھی "اصلش از لاہور است" تحریر فرمایا ہے لیکن یہ فقرہ ہی نہیں بلکہ اور سارا بیان یہاں تک کہ غلط تاریخ وفات کا اعادہ بھی اس بات کو صاف ظاہر کرتا ہے کہ کم از کم جہاں تک قتیل کا تعلق ہے شمع انجمن، نتائج الافکار کی ہی مرہون منت ہے۔ نواب صاحب نے اختصار فرمایا ہے لیکن وہ مولوی قدرت اللہ کی تقلید میں کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ اس لئے شمع انجمن کا یہ بیان علٰحدہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اور اس پر وہی تنقید صادق آتی ہے جو نتائج الافکار پر اوپر ہو چکی ہے۔

ایک اور نام نہاد تذکرہ 'یدبیضا' (۵) نے مرزا قتیل کو بٹالہ کا متوطن بتایا ہے۔ اس تذکرہ کو مصحفی کی تصنیف کہا گیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہوتا تو اس کی قیمت کچھ نہ کچھ بڑھ ہی جاتی۔ لیکن شکر ہے اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ مصحفی کا کوئی تذکرہ اس نام (یدبیضا) سے نہیں لکھا گیا۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اس تذکرہ کا ذکر جناب مشیر احمد صاحب علوی کاکوروی نے نگار کے مصحفی نمبر میں "مصحفی کی دو گمشدہ بیاضیں" کے تحت میں بالتفصیل فرمایا ہے۔ لیکن ابھی بقول شخصے کاغذ کی سیاہی بھی سوکھنے نہ پائی تھی کہ جناب مختار الدین احمد صاحب آرزو نے اپنے مضمون "مصحفی نمبر کی بعض لغزشیں" مطبوعہ نگار ماہ اپریل ۱۹۳۹ء میں اس بوستان خیال کا بھرم کھول دیا۔ یہ سارا مضمون پڑھنے کے قابل ہے۔ لیکن طوالت کے خوف سے ہم طویل اقتباسات نذر ناظرین نہیں کریں گے بلکہ صرف نتائج کو جناب آرزو ہی کی زبان میں پیش کئے دیتے ہیں۔ آرزو صاحب فرماتے ہیں "میں یہ کہدینے کے لئے تیار ہوں کہ "مصحفی کی دو گمشدہ بیاضیں" جعل کا بہترین نمونہ ہے اور "یدبیضا" اور "نور ازل" جناب مشیر کے بحر تخیل کی صرف موجیں ہیں اور بس" آرزو صاحب نے ثابت کیا ہے کہ یہ نئی بیاضیں مصحفی کے تینوں معروف تذکروں کے بیانات کو الٹ پھیر کر گھڑ لی گئی ہیں "واقعات کی بے ربطی سنین کی غلطی اور بیانات کا اُلجھاؤ" مستزاد ہے۔ میں جناب آرزو کے اس محاکمے پر پوری طرح مطمئن نہ تھا اس لئے آخر فروری ۴۲ء میں ایک موقعہ نکال کر خود کاکوری گیا۔ وہاں مشیر احمد صاحب سے تو ملاقات نہ ہو سکی لیکن ان کے والد محترم جناب امیر احمد صاحب علوی سے نیاز حاصل ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ "بیاض یدبیضا از مصحفی" کوئی کتاب نہ اسوقت ان کے کتب خانہ میں ہے نہ کبھی پہلے تھی۔ نہ کبھی اُن کی نظر سے ایسی کتاب گزری۔ فرماتے تھے کہ "میں نہیں بتا سکتا کہ مشیر صاحب کو ایسا مغالطہ کیونکر ہوا یا یہ کہ ان کا ماخذ کیا تھا۔ تکیے شریف میں ایک صاحب کے تین قلمی تذکرے ہیں ایک فارسی شاعروں کا ایک اُردو شاعروں کا اور ایک شاعر عورتوں کا۔ لیکن یہ تذکرے مصحفی کے لکھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ مسرور کاکوروی کے شاگرد کے لکھے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے ان کو دیکھ کر مشیر صاحب کو دھوکا ہوا ہو" غرض یہ بات اب بالکل ثابت ہے کہ "یدبیضا" مصحفی تخیل کی بلند پروازی کے سوا کچھ نہیں۔ بے وجود چیز پر مزید تنقید و تبصرہ بے کار ہے۔

حسب بالا چار تذکروں کے علاوہ چار اور تذکرے یعنی عقد ثریا۔ مخزن الغرائب، گلشن مشتاق اور خوش معرکۂ زیبا اس معاملہ میں خاموش ہیں۔ گلشن مشتاق اور خوش معرکۂ زیبا کی خاموشی پر تو کوئی تعجب نہیں کہ ممکن ہے ان اصحاب کو قتیل کے وطن کے متعلق علم نہ ہوا ہو لیکن مخزن الغرائب اور عقد ثریا کے مولف (احمد علی ہاشمی اور مصحفی) کی یہ فروگزاشت واقعی بے حد حیرت انگیز ہے مصحفی کے تعلقات مرزا قتیل سے بہت گہرے تھے اور عقد ثریا اصل میں مرزا قتیل ہی کی تحریک پر لکھی گئی تھی۔ اس طرح احمد علی ہاشمی کے وہ اُستاد محسن اور رہنما تھے اور مخزن الغرائب مرزا قتیل ہی کے اشارے پر اور ان کی مدد سے لکھی گئی تھی۔ اس کے باوجود یہ دونوں اصحاب اپنی انہی کتابوں میں جو محض مرزا قتیل ہی کی تحریک اور امداد سے لکھی گئی تھیں مرزا قتیل کے وطن کے متعلق بالکل خاموش ہیں۔ یہ بے شک بے حد تعجب انگیز ہے۔ لیکن گمراہ کن نہیں۔ اگر اصل وطن نہیں بتایا گیا ہے تو کم از کم لکھنؤ، لاہور یا اور کوئی ایسی ہی جگہ لکھ کر غلط بیانی بھی نہیں کی ہے اس موقعہ پر یہ نہ تو بھولنا چاہئے کہ یہ پرانے تذکرے اکثر جزئیات اور تفصیلات میں حیرت انگیز تغلیط اور تقصیر کے حامل ہوتے ہیں۔ ابھی جوشش کا دیوان چھپا ہے۔ اس کے مرتب جناب قاضی عبدالودود صاحب نے ۸ تذکروں سے جوشش کا حال نقل کیا ہے۔ اور گو اس بیان میں اختصار کا یہ عالم ہے کہ کسی تذکرہ نویس نے بھی دو چار سطروں سے زیادہ حال نہیں لکھا لیکن وہ بھی مختلف اور اکثر متضاد ہے۔ جوشش کے ہمعصر اور ہموطن تذکرہ نویس جو خود جوشش سے گہرے تعلقات کے بھی دعویدار ہیں اکثر ان کے بیان میں بہک گئے ہیں مثلاً تذکرہ شورش۔ گلزار ابراہیم۔ تذکرہ عشقی میں سے ایک نے بھی جوشش کے تبدیل مذہب یا ولدیت کے متعلق کچھ نہیں لکھا گو یہ نہایت اہم بات تھی مصحفی نے اپنے تذکرہ میں جوشش کا نام ہی سرے سے بدل دیا ہے۔ اور گو جوشش، مصحفی سے عمر میں دس سال چھوٹے تھے لیکن مصحفی نے ان کو قدما میں گنوایا ہے۔ بعد کے تذکروں میں یہ غلط فہمیاں قائم ہیں، مصحفی کے متعلق قاضی عبدالودود صاحب فرماتے ہیں:۔ "کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ایسی غلطیاں اُن سے بہت ہوئی ہیں" اصل یہ ہے کہ ان پرانے تذکروں کا مقصد ہی ذاتی حالات کے بیان کا نہ ہوتا تھا اور نہ اس کی کوئی اہمیت تھی۔ چنانچہ صاحب سخن شعرا دیباچہ میں فرماتے ہیں " میں نے بھی چاہا کہ شربت تالیف سے کوزے بھروں اور اس قند کو مکرر کروں یعنی اس طرح کا تذکرہ لکھوں جس میں اشعار آبدار میں اطناب و اعجاز ہو اور احوال شعرا میں اختصار و ایجاز اور حالات ابنائے زماں کو بقدر طاقت بشری جامع اور حشو و زوائد کو مانع ہو"

تین تذکرے (خلاصۃ الافکار۔ قاموس المشاہیر۔ لکھنؤ کی زبان) مرزا قتیل کو دہلوی بتاتے ہیں۔ اور یہی قرین صحت ہے (اگرچہ اصل میں وہ فرید آبادی تھے جیسا کہ آئندہ عرض کیا جائے گا) ان تذکروں کے علاوہ اور بھی ثبوت ہیں جن سے مرزا قتیل کا دہلی اعظم[1] کا ہونا ثابت ہے۔ سید انشا اللہ نے دریائے لطافت میں شرائط زباندانی کو متعدد بار گنوایا ہے اور طرح طرح سے یہ کہا ہے کہ اُردو زبان کے متعلق مستند وہی ہے جو دلی کا باشندہ ہو۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:۔ "اس شان کے حاصل کرنے کے لئے متکلم کے شاہجہاں آباد میں پیدا ہونے اور وہاں کے فصیحوں میں اعتبار حاصل کرنے کی شرط لازم ہے" ایک اور جگہ زباندانی کی چار شرطیں جو گنوائی ہیں ان میں پہلی یہ ہے کہ " اس کا ثبوت کہ اس شخص کے والدین دارالخلافہ کی خاک پاک سے ہیں"۔ یہی نہیں کہ دلی کی چند روزہ بود و باش پر قناعت ہے۔ بلکہ اسی لئے ان لوگوں کو ممیز کر دیا ہے جو باہر سے آکر دلی میں بس پڑے ہوں۔ اس ضمن میں پنجابیوں کی خصوصیت سے تصریح کر دی ہے۔ اسی لئے کئی عنوان ایسے ثم الدہلوی پنجابیوں کے متعلق قایم کئے ہیں مثلاً "پنجابی لہجہ" "پنجابی اُردو داں کے کلام کی مثال" "پنجابی لہجے اور خصوصیات"۔ "پنجابی آیند روند" وغیرہ اور ان سب کو پایۂ فصاحت سے گرا ہوا بتایا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق ایک جگہ فرماتے ہیں:۔ "۔۔۔۔۔۔ یہ الفاظ ان لوگوں کی زبان کے ہیں جن کی اصل پنجاب سے ہے۔ یعنی لاہور۔ کلانور۔ پٹیالہ۔۔۔۔۔۔۔ سے آئے ہیں" ایک اور جگہ لکھتے ہیں "یہ امر بھی احباب کے ذہن نشین رہے کہ دہلوی ہونا ایک شخص کے دہلی میں پیدا ہونے پر منحصر نہیں ہے۔ ورنہ مغلپورہ[2] محلہ کے رہنے والے جو شاہجہاں آباد میں پیدا ہوتے ہیں دہلوی ہونے چاہئیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ دہلوی وہ ہے جس کا روزمرہ وہ ہو جو دہلی والوں کا ہے۔۔۔۔ بخلاف اس کے مغلپورہ والوں کو دیکھو کہ ان کی گفتگو لاہور والوں سے ملتی ہے" پھر بھلا اگر قتیل پنجابی ہوتے اور لاہور یا کسی اور مقام سے آئے ہوئے ہوتے تو انشاء اللہ خاں ان کے ساتھ اُردوئے معلّٰی کی سب سے پہلی قواعد و معانی کی کتاب کیسے تصنیف کرتے یہی نہیں بلکہ انشاء اللہ نے دیباچہ میں قتیل کے متعلق صریحاً کہدیا ہے کہ " رد کردہ او بے تامل رد کردۂ من و پسندیدۂ او پسندیدۂ ایں کثر مشربیاں بودہ است۔ و از صغر سن میانِ من و او ہر چیز حصہ برادرانہ قرار پذیرفتہ" یہ محض آمد سخن نہیں ہے بلکہ اس پر عمل ہے مثلاً ہفت تماشہ میں قتیل نے ایک جگہ لکھا ہے "حلال خور۔ ہر چند ایں لفظ در اصل غلط است کہ کمنی انچہ مشہور است ہمیں است" دریائے لطافت میں بعد میں انشاء اللہ لکھتے ہیں "لفظ حلال خور اگرچہ اصل میں غلط ہے لیکن چونکہ ہندوستان میں کثیر الاستعمال ہے اس لئے اُردو میں فصیح ہے" یا تشریح تنافر غرابت کی بحث

---

[1] دہلی اعظم۔ یہ اصطلاح میں نے (Greater London) کے نمونے پر وضع کی ہے۔ یعنی شہر مع توابع

[2] دہلی کا ایک محلہ۔

میں لکھا ہے "مخدا بخشے مرزا علی نقی محشر مقتول نے کہا "پانی النیڈلو" اُردو ہے۔" پانی نائے لو" پورب کی زبان ہے۔ مرزا قتیل نے جواب دیا کہ پانی النیڈلو وہ لفظ ہے کہ شاہجہاں آباد کے شرفا اور عوام کے کان اس سے ناآشنا ہیں۔ اور پانی نائے لو پورب والوں کے سوائے کوئی نہیں سمجھتا یا آپ سمجھتے ہیں۔ پس جو لفظ اہل اُردو کے سننے میں نہیں آیا اس کو اُردو کی عبارت میں لانا غرابت کا نقص عاید کرنا ہے اور فصاحت کے راستے سے بھٹک جانا ہے" یہ خیال رہے کہ مرزا علی نقی محشر شاعر تھے۔ لکھنوی تھے اور دلی میں بھی دو تین سال رہ آئے تھے۔ انکی بات پر یہ حرا کہ کسی ایسے شخص سے ظہور میں نہیں آسکتا جو اصلاً پنجابی ہو اور دلی میں صرف کچھ دن رہ لیا ہو۔ اگر متشککین اب بھی مطمئن نہ ہوں تو انکے لئے داخلی اور قطعی ثبوت میں خود مرزا قتیل مرحوم کے کلام کی صریح اور بین شہادت پیش کی جاتی ہے۔ دیوان قتیل ست کی ردیف میں ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے:-

تا برقص آں فتنۂ کون و مکاں برخاست است — صد بلائے ناگہاں از ہر کراں برخاست است

اس کا مقطع ملاحظہ فرمائیے:-

گرچہ باشد مولد من خاکِ دہلی اے قتیل — کم کسے چوں من زیزد وایروواں برخاست است

لیکن یہ سوال پھر بھی رہ جاتا ہے کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ قتیل دلی کے تھے تو بھی یہ فرید آبادی ہونے کے مرادف کیونکر ہوا۔ کیونکہ ہمارا دعوے تو یہ ہے کہ قتیل فرید آبادی تھے اس کے ثبوت میں حسب ذیل شہادتیں پیش کی جاتی ہیں جو اُمید ہے شافی سمجھی جائیں گی۔

۱- اول تو یہ بات ملاحظہ طلب ہے کہ اکثر جب وطن کوئی نسبتاً غیر مشہور جگہ ہو تو قریب کے شہر سے نسبت وطن ظاہر کی جاتی ہے۔ آج کل کے زمانہ میں بھی جبکہ رسل و رسائل اور تعلیم و خواندگی بہت عروج پر ہے یہی طریقہ ہے کہ مفصلات کے رہنے والے تقریباً بلا استثنا اضلع یا قریب کے شہر سے نسبت وطن ظاہر کرتے ہیں۔ اب سے ڈیڑھ سو سال پہلے تو یہ زیادہ تر ہوتا تھا۔ فرید آباد نہ صرف دلی کے ضلع میں تھا بلکہ دلی سے بہت ہی قریب بھی تھا۔ انگریزوں نے شروع میں دلی کے جنوبی رخ (جدھر فرید آباد ہے) سے بے رُخی برتی اور توسیع شہر شمالی میں کی گو اب بھی دلی جنوب ہی کی طرف بڑھ رہی ہے لیکن اب بھی وہ سورت نہیں ہے جو اب سے ڈیڑھ دو سو برس پہلے تھی۔ اُس زمانے میں نظام الدین۔ عرب سرائے۔ شیخ سرائے۔ قطب آباد۔ خواجہ کی سرائے اور فرید آباد گویا مسلسل دلی ہی کے محلے تھے۔ ان مقامات کے لوگ اکثر اپنے آپ کو دہلوی ہی کہتے تھے۔ میر مہدی مجروح عرب سرائے کے رہنے والے تھے اگرچہ سارے تذکرہ نویس اور وہ خود بھی اپنے کو دہلوی کہتے ہیں۔ مختصراً اگر قتیل نے خود اپنے کو دہلوی کہا یا دیگر تذکرہ نویسوں نے ان کو دہلوی لکھا تو یہ غلط نہیں بلکہ حسب دستور درست ہے۔ اس قسم کی مثالیں بے شمار دی جا سکتی ہیں اسی مضمون میں محمد حافظ علی مشتاق صاحب گلشنِ مشتاق کا حوالہ اوپر گزرا ہے۔ وہ اپنے کو میرٹھ آبادی لکھنوی یا صرف لکھنوی لکھتے تھے

۲- چار اصحاب (غالب۔ حالی۔ نجم الغنی اور فرقتی) نے صریحاً قتیل کا فرید آبادی ہونا بیان کیا ہے۔ فرید آباد کچھ بہت مشہور و معروف قصبہ نہیں ہے کہ سہواً یا عادتاً اس کی طرف نسبتِ سکونت عائد کر دی جائے۔ یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ جب تک علم صحیح نہ ہو کوئی تذکرہ نویس فرید آباد کی سکونت کا اظہار نہیں کر سکتا۔ دہلی۔ لکھنؤ۔ لاہور یا ضلع ملک مثلاً پنجاب۔ پورب۔ دکن۔ بنگال۔ اودھ وغیرہ کی نسبت تو اندازاً بھی بتائی جا سکتی ہے۔ لیکن اس طرح کسی غیر مشہور قصبہ کا خصوصیت سے نام لیا جانا ممکن نہیں۔ پھر غالب دہلوی۔ حالی پانی پتی فرقتی دہلوی اور نجم الغنی سورخ نے کیونکر قتیل کو فرید آبادی لکھا؟ غور فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ دوسرے تذکرہ نویسوں کی طرح "باہر والے" نہ تھے کہ دلی اور فرید آباد کے فرق کو نہ جانتے غالب دلی میں براج رہے تھے جب قتیل کا طوطی لکھنؤ میں بول رہا تھا۔ خواجہ حالی بھی زیادہ تر دلی ہی میں رہے بلکہ فرید آباد کو بھی در دو مسعود سے عزت بخشی۔ فرقتی بھی دہلوی ہیں اور حالات سے آگاہ۔ حکیم نجم الغنی بے شک رامپور کے تھے لیکن وہ مورخ ہیں محض تذکرہ نویس نہیں۔ انھوں نے غالباً زیادہ تحقیق کے بعد کچھ لکھنا مناسب سمجھا۔

۳- مرزا قتیل کی تحریر میں فرید آباد کے متعلق بھی داخلی شہادت ملتی ہے گو یہ کنایۃً ہے نہ کہ صریحاً۔ شجرۃ الامانی میں ثمرۂ سوئم کے تحت میں لکھتے ہیں "در بیان فارسیِ اہلِ ہند لیکن کسانے کہ مقلد و مجانسِ اہلِ زبان نہ باشند و آں بر دو گونہ بود۔ یکے فارسیِ کتابی و آں ہر چند خلاف روزمرہ زبان واقع شود لیکن صحیح باشد۔ مثال آں:- دیروز نہ چناں بہ خاطر من جانو کہ پاسے از روز بر آمدہ برائے ملاقاتِ گرامی بسیائم لیکن یکے از دوستاں بمن گفت کہ میرزا صاحب پے کارے برجناح استعجال بجانبِ فرید آباد قطرہ زن شدہ انو شمارا از رفتن درچنیں شدت گرما و ہم آغوش حرماں باز آمدن چہ حاصل۔ اگر ایں چنیں خیال بخاطر بستہ آید یکسو ہفتہ مشغول بہ کارِ دیگر باید ماند تا مرزائے مذکور را از کارِ خود دلیلی حاصل نمودہ بخانہ خود بیاید۔ آں زماں اگر دل دستوری دہد رفتہ از سخنانِ شیریں دل آویز مشارالیہ کام آرزو را رشک تنگ شکر و طبلہ انگبیں باید نمود۔ بنابراں در آمدنِ مخلص تو قف بظہور آمد"

یہ رقعہ غالباً مرزا قتیل کے کسی جاننے والے کا ہے جو ان کے نام لکھا گیا اور جو انھوں نے مثال کے موقعہ پر نقل کیا ہے۔ ممکن ہے کوئی صاحب اس میں شک کریں اور فرمائیں کہ یہ تو مثالاً ایک عبارت لکھ دی گئی ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ایسے اصحاب یہ غور فرمائیں کہ شجرۃ الامانی سنہ ۱۲۸۶ھ میں لکھی گئی تھی جبکہ مرزا قتیل کو وطن چھوڑے ہوئے اور دلی میں آئے ہوئے کم از کم ۲۲ سال (اگر وہ ۱۸ سال کی عمر میں آئے) اور زیادہ سے زیادہ ۴۰ برس (اگر ان کے والدان کی پیدائش سے پہلے ہی فیض آباد آ گئے تھے) ہو چکے تھے۔ لکھنؤ میں اتنے لمبے

عیش و آرام کے قیام کے بعد کتاب لکھی جاتی ہے اور مثال میں بے ساختہ دلی سے فرید آباد جانے کا ذکر آجاتا ہے۔ کیا اس شخص سے اس چیز کا امکان ہے جو پنجاب سے آیا ہو اور لکھنؤ پڑا ہو کیا کوئی لکھنوی جو کچھ دن کو دلی ہو آیا ہو اپنی کتاب میں ایسی مثال دے سکتا ہے۔ کیا کوئی دلی شہر کا باشندہ جو زیادہ سے زیادہ ۱۸ سال کی عمر میں فیض آباد اور لکھنؤ کو انتقالِ سکونت کر گیا ہو، سو برس بعد بھی اپنی کتاب میں مثال دینے کے لئے ایسی عبارت سوچ سکے گا۔ فرید آباد کچھ ایسی جگہ نہیں ہے کہ خواہ مخواہ اس کی طرف ذہن منتقل ہو یا اس کا نام زبان زد خلائق ہو۔ پھر کیا مرزا قتیل کا فرید آباد کا اس طرح بیان محض اتفاقی ہے؟

۲۔ ایک آخری لیکن قوی دلیل یہ ہے کہ مرزا قتیل مرحوم کا خاندان ابھی تک فرید آباد میں آباد و خوشحال ہے۔ یہ کھتری صاحبان قصبہ کے معززین میں سے ہیں۔ ان کی وہی گوت ہے جو قتیل کی بتائی گئی ہے۔ فیض آباد کے کھتریوں سے ان کی اب تک رسم و راہ اور رشتہ داری ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ ان کے پاس قدیم شجرہ موجود ہے جس میں آج تک کے اندراج موجود ہیں۔ لیکن درگا ہی مل والد مرزا قتیل کے آگے کوئی نام نہیں دیا گیا ہے غالباً اس لئے کہ درگا ہی مل کے صاحبزادے مرزا قتیل مسلمان ہو گئے تھے۔

یہ جو بعض تذکرہ نویسوں نے لکھ دیا ہے کہ قتیل کے باپ فیض آباد آ گئے تھے جہاں مرزا قتیل تولد ہوئے یہ بھی محض غلط معلوم ہوتا ہے۔ مرزا قتیل غالباً ۱۱۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اسوقت فیض آباد کچھ مشہور جگہ نہ تھی۔ کچے مٹی کے مکانات اور کچھ ڈیرے خیمے تھے اور یہ جگہ "بنگلہ" کہلاتی تھی۔ اس وقت بلکہ اس سے بھی پہلے بھلا کوئی کیوں ترک وطن کر کے یہاں آتا۔ اس زمانہ میں تو اودھ کے نواب وزیر بھی یہاں نہ رہتے تھے بلکہ ان کے عامل رہتے تھے۔ ۱۱۷۰ھ میں شجاع الدولہ نے فیض آباد کو دارالریاست بنایا لیکن ابھی پورے طور پر شہر بنے بھی نہ پایا تھا کہ ۱۱۸۸ھ میں آصف الدولہ نے پھر لکھنؤ کو مستقر بنا لیا۔ گویا اگر کسی نے فیض آباد آنا چاہا ہوگا تو اسی دس سال کے عرصہ میں آیا ہوگا۔ لیکن قرائن ایسے ہیں کہ غالباً اس زمانہ میں بھی بہت کم لوگ اپنے بال بچوں سمیت فیض آباد گئے ہوں گے۔ شجاع الدولہ نے پابندی لگا رکھی تھی کہ کوئی عورت بوڑھا جوان یا بچہ بغیر خاص اجازت نامہ کے فیض آباد کی حدود سے باہر نہ جانے پائے۔ اس کی سختی سے پابندی ہوتی تھی اور اس کے انتظام کے لئے چوبیس گھنٹے دو پہرے ہوتے تھے۔ ایسی حالت میں سوائے سرکاری ملازمین کے بھلا کوئی کیوں اپنی عورتوں سمیت اس شہر میں آتا ہوگا۔ بہرحال یہ مسئلہ مزید تحقیق چاہتا ہے۔ میں تو خواجہ حالی مرحوم کی رائے سے متفق ہوں کہ مرزا قتیل دلی ہی میں اکتساب علم اور تبدیلی مذہب کر چکے تھے اور اس کے بعد لکھنؤ گئے۔

سید اسد علی انوری ۔ فرید آبادی

دی مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قایم کی ہوئی واحد جہاز ران کمپنی

تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بمبئی اور کراچی سے عدن اور پورٹ سوڈان، جدہ اور سویز تک جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام

سفری اور باربرداری کے جہازات بمبئی اور کراچی سے عدن، پورٹ سوڈان۔ جدہ اور سویز تک

مسافر اور مال و اسباب لے جاتے ہیں، نیز بمبئی اور کراچی سے پورٹ لوئی اور ماریشس تک سفر کرتے ہیں

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کیجا سکتی ہیں

مزید تفصیلات کے لئے لکھئے:۔ ٹرنر مارسین ۔ اینڈ کمپنی لمیٹڈ نمبر ۱۶ ۔ بنک اسٹریٹ بمبئی

جاپان کے خوفناک ارادے

اور

اُسکی کامیابیوں کے راز

ہٹلر کی کتاب "میری جدوجہد" بہت مشہور چیز ہے، جس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے ساری دنیا کو فتح کرنے اور جرمن قوم کو دنیا کی تمام دوسری قوموں پر حکمران بنانے کی کیا کیا تدابیر پہلے سے سوچ رکھی تھیں، لیکن شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جرمنی کی طرح جاپان بھی یہ سودا عرصہ سے اپنے دماغ میں لئے ہوئے تھا

اس سلسلہ میں ٹناکا کی وہ یادداشت جو اس نے جولائی ۱۹۲۷ء میں مکاڈو شاہ جاپان کے سامنے پیش کی تھی بہت مشہور چیز ہے۔ ٹناکا، جاپان کا وزیر اعظم تھا اور اسنے جاپان کے تمام فوجی و غیر فوجی افسروں کی کانفرنس طلب کرکے، ایک یادداشت مرتب کی تھی جس میں، بتایا گیا تھا کہ تمام مشرق بعید کو کس طرح جاپانی مستعمرہ بنایا جاسکتا ہے

اس یادداشت میں عام تدابیر کے سلسلہ میں ایک جگہ یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ دنیا پر اپنا تسلط قایم کرنے کے لئے سب سے پہلے ہم کو چین پر اقتدار حاصل کرنا چاہئے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے امریکہ کو شکست دیجائے، ویسی ہی شکست جیسی ہم روس کو دے چکے ہیں۔ اور اس کے بعد یا پہلے منچوریا اور منگولیا پر قبضہ کیا جائے

اگر ہم چین کو فتح کرلیں گے تو ایشیا کے دوسرے ملک اور جنوبی سمندر کے جزیرے ہمارے سامنے اپنا سر جھکا دیں گے اور پھر ہم ہندوستان، ایشیائے کوچک، وسط ایشیا اور یورپ کو زیر کرنے کے لئے آگے بڑھیں گے"۔

اس یادداشت کے ایک اور حصہ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ:- "ہمیں اپنے ملک کی توسیع کے سلسلہ میں شمالی منچوریا میں روس سے دوسری جنگ کرنا از بس ضروری ہے کیونکہ جب تک ماسکو سے یہ پتھر ہٹ جائے ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہم نے اپنا سب سے پہلا فاتحانہ قدم فارموسا میں اُٹھایا (۱۸۹۵ء)، دوسرا قدم وہ جب کوریا پر قبضہ کیا (۱۹۱۰ء) تیسرا قدم منچوریا اور منگولیا کو فتح کرنا تھا (۳۱-۱۹۳۲ء) اور اب اگلا قدم چین کی طرف ہوگا۔ افسوس ہے کہ یہ آخری قدم ہم نے ابھی نہیں اُٹھایا۔ کیونکہ اس کے لئے بڑی طیاریوں کی ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں ہم کو برطانیہ اور امریکہ کی متحدہ قوت سے جنگ کرنا پڑے گی"

جب فتح منچوریا کے بعد ٹناکا کی یہ یادداشت شایع کی گئی تو جاپانیوں نے اس کی صحت سے انکار کیا، لیکن چین میں برابر ۲۹ء سے اس کی اشاعت ہورہی ہے اور پھر جاپان نے اسکی تردید بھی نہیں کی۔ علاوہ اس کے دوسرا ثبوت اس یادداشت کے وجود کا مسٹر ونگ کی کتاب ("Le Peril Jaune") ہے جو ۳۸ء کی جنیوا والی بین الاقوامی صلح کانفرنس کی طرف سے شایع کی گئی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ ۳۱ء سے برابر جاپان اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ وہ سارے ایشیا پر چھا جائے۔ چنانچہ جولائی ۳۷ء میں اس نے شمالی چین پر حملہ کرکے ۴۱ء تک گیارہ صوبوں پر اس نے فوجی قبضہ کرلیا اور اس کے بعد فرانسیسی انڈوچائنا پر تسلط جمالیا۔

اول اول جب جاپان نے چین کے خلاف قدم اُٹھایا تھا، اسی وقت سے جاپان کے ہٹلرانہ ارادے دوسرے ذرایع سے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں جنرل اراکی کی ایک تحریر جو اگست ۳۲ء کے ایک جاپانی میگزین میں شایع ہوئی تھی بہت اہم ہے۔

جنرل اراکی، جاپان کی عسکری جماعت کا بہت بڑا شخص ہے اور اس کا بیان گویا جاپان کے صحیح صحیح ارادوں کا اظہار ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:- ہمارا ملک اپنے قومی نصب العین کو ساتوں سمندر پار کرکے پورا کرنا چاہتا ہے، اگر اس کے لئے ہم کو لڑنے کی ضرورت پڑی تو ہم لڑیں گے، کیونکہ ہم خدا کی نسل سے ہیں اور ہمیں ساری دنیا پر حکومت کرنا چاہئے لیکن اس مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ پہلے چین کی تمام خام پیداوار پر ہمارا قبضہ ہوجائے۔

جب منچوریا اور منگولیا پر جاپانیوں نے قبضہ کیا تو انھوں نے توجیہ یہ کی کہ ہمیں اپنی بقائے حیات کے لئے زمین کی ضرورت ہے اور چین کے ان علاقوں پر ہمارا قبضہ کرنا بالکل فطری اقتضا ہے۔ بالکل یہی توجیہ ہٹلر بھی کرتا ہے کہ جرمن آبادی کی زندگی اور ضروریات کے لئے اس پاس کے ملکوں کو تسخیر کرنا ضروری ہے۔ جاپان اور جرمنی کی یکساں ذہنیت کا ایک اور ثبوت ملاحظہ ہو:-

جب جاپان کے وزیر اعظم پرنس کونوئے نے ۳۷ء میں چین کے خلاف موجودہ جنگ چھیڑی تھی تو اس نے اعلان کیا تھا کہ مشرقی ایشیا میں وہ جاپان کی سیادت میں ایک نیا نظام حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح جب ہٹلر نے یورپ میں لڑائی چھیڑی تو اس نے بھی یورپ میں ایک نئے نظام حکومت کے قائم کرنے کا اعلان کیا۔

اس میں شک نہیں کہ جاپان کے اس جدید نظام حکومت میں صرف چین اور منچو کو شامل تھے، لیکن جب اس نے دیکھا کہ جرمنی کو یورپ میں غیر معمولی کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں، تو اس نظام میں اس نے جزائر فلپائن، سنگاپور، انڈوچائنا، ڈچ انڈیز اور ہندوستان کو بھی شامل کر لیا اور دوسری طرف ہٹلر نے اپنے نئے نظام میں نہ صرف تمام یورپ بلکہ افریقہ اور جنوبی امریکہ کو بھی داخل کرنے کا اعلان کر دیا۔

محوری طاقتوں کے اتحاد ثلثہ میں جو شرائط طے پائے ہیں ان کی رو سے جاپان اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ یورپ میں جرمنی اور اٹلی کی سیادت کو مانے گا اور جرمنی و اٹلی نے اقرار کیا ہے کہ وہ ایشیا میں جاپان کی سیادت کو تسلیم کریں گے۔

جاپان کے موجودہ وزیر اعظم ٹوجو نے بھی پچھلے نومبر میں جاپان کے اس جدید ایشیائی نظام کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم اپنے ارادوں کی تکمیل کے لئے ایشیا کو فتح کرنے پر مجبور ہیں۔

جاپانیوں کے اس خیال کا تاریخی پس منظر یہ اعتقاد ہے کہ وہ سورج دیوتا کی اولاد میں سے ہیں اور ان کو ساری دنیا پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔

سیاسی تنظیم کے لحاظ سے جاپان حد درجہ پست ملک ہے اور وہاں کی حالت وہی ہے جو انقلاب سے پہلے روس میں پائی جاتی تھی۔ یہ لوگ نہایت خلوص کے ساتھ یقین رکھتے ہیں کہ میکاڈو (شاہ جاپان) انسانی صورت میں خدا ہے، اسی لئے وہ میکاڈو اور اس کے وزیروں کے حکم کو خدا کا حکم سمجھ کر اس کی تعمیل کرتے ہیں اور یہ لوگ جاپانی پبلک کے اس اعتقاد سے ناجائز فایدہ اٹھاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مادی ترقی کے لحاظ سے جاپان بالکل یورپ کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے لیکن اپنے اعتقادات کے لحاظ سے وہ حد درجہ وحشی ہے ان کے فلسفہ، ان کے لٹریچر اور ان کے آرٹ کا ماخذ قدیم چینی تہذیب ہے، لیکن ان کی سائنس بالکل مغرب کی چیز ہے، جسے انھوں نے انیسویں صدی کے آخری دوسرے حصہ میں حاصل کر کے انتہائی ترقی تک پہونچا دیا۔

ان کی قومی اسپرٹ، ان کے اقتصادی اور سماجی حالات سے پیدا ہوئی ہے اور دنیا کی کوئی مہذب قوم ذات پات یا سوسائٹی کے لحاظ سے اتنی پراگندہ نہیں ہے جتنی جاپانی قوم۔

حکمراں طبقہ، یہاں کے کاشتکاروں اور مزدوروں کو اپنا غلام سمجھتا ہے اور جاپان کی ۸۰ فی صدی دولت صرف دس خاندانوں میں تقسیم ہے جن میں دو خاندان (مٹسوئی اور مٹسوبشی) بہت مشہور ہیں اور وہاں کی تمام تجارت اور صنعت و حرفت پر انھیں کا قبضہ ہے۔

جاپان کے حکمراں طبقہ میں ایک جماعت اُن بڑے بڑے فوجی افسروں پر بھی مشتمل ہے جو شادی بیاہ کے ذریعہ سے حکمراں حلقہ میں شامل ہو گئے ہیں اور دفتری اقتدار انھیں کے ہاتھ میں ہے۔

نوجوان فوجی طبقہ جس میں سب کے سب غریب شامل ہیں، بالکل جاہل ہے اور اسے کچھ نہیں معلوم کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، وہ آنکھ بند کر کے صرف جان دینا جانتا ہے اور ساری دنیا پر چھا جانے کا جذبہ اس میں اتنا قوی ہے کہ وہ کبھی کبھی اس الزام میں اپنے افسروں کی بھی جان لے لیتا ہے کہ جاپانی فتوحات میں کیوں اس قدر دیر ہو رہی ہے۔

جاپانی کامیابی کا راز

جو کچھ بیان کیا گیا اس سے وہ پس منظر ظاہر ہو جاتا ہے جو جاپانیوں کے فوجی اقدامات کی بنیاد ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ سوال بھی غور طلب ہے کہ اتنے تھوڑے زمانہ میں کیوں اسے اتنی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ کیا یہ صرف کسی اعتقاد کا نتیجہ ہے۔ نہیں، بلکہ اس میں کچھ اور باتیں بھی شامل ہیں۔

جاپان میں پہلے بالکل جاگیردارانہ حکومت قایم تھی، اور ہر جاگیردار اپنی فوج رکھتا تھا جو نہایت ہی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ ہر چند اب وہاں کا نظام حکومت بدل گیا ہے لیکن جو قومی اسپرٹ وہاں پہلے پیدا ہو چکی تھی اب بھی پائی جاتی ہے اور فوج کی خدمت کو وہاں نہایت ہی معزز سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے فوجی خدمت کا اہل نہیں سمجھا جاتا تو وہ شرم کی وجہ سے خودکشی کر لیتا ہے۔ اس لئے وہاں کا سپاہی اس لئے نہیں لڑتا کہ وہ لڑنے کا معاوضہ پاتا ہے بلکہ صرف اس لئے کہ وہ لڑ کر جان دینے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جاپانی سپاہی حد درجہ محنتی و جفاکش ہوتا ہے اور اس باب میں وہاں کی معاشرت کو بڑا دخل ہے۔ آپ ان کی معاشرت کا مطالعہ کریں گے تو

معلوم ہوگا کہ ایک جاپانی کمرہ میں داخل ہونے سے پہلے ہمیشہ جوتا اُتار ڈالتا ہے تاکہ فرش خراب نہ ہو۔ آپ اس کے کمرہ میں کوئی فرنیچر نہ دیکھیں گے وہ فرش ہی پر بیٹھتا ہے وہیں کھاتا پیتا ہے اور وہیں سب کچھ کرتا ہے۔

جب سونے کا وقت آتا ہے تو الماری سے چٹائی نکال کر اسے بچھا لیتا ہے اور صبح کو اسے پھر لپیٹ کر رکھ دیتا ہے —— وہاں کی فوجی بارکیں زلزلے کے خوف کی وجہ سے لکڑی کی ہوتی ہیں اور ان میں بھی کوئی فرنیچر نہیں ہوتا، زمین ہی پر تمام سپاہی اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ اس سادہ معاشرت کا نتیجہ یہ ہے کہ میدانِ جنگ میں بھی وہ زمین پر آرام سے سو سکتے ہیں اور ان کی راحت رسانی کے لئے میز، کرسی، یا پلنگ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ان کی وردی ویسی ہی ہوتی ہے جیسی یورپین سپاہی کی، لیکن وہ کم سے کم کپڑا خرچ کرکے زندگی بسر کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے وہاں کا قاعدہ یہ بھی ہے کہ ہر سپاہی خود ہی اپنی وردی کی مرمت بھی کرتا ہے اور میدانِ جنگ میں درزیوں کا انتظام نہیں کیا جاتا۔ جاپانی سپاہیوں کی غذا کا مسئلہ بھی نہایت سادہ ہے۔ ان کی غذا چاول اور ترکاری کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ وہاں کے سپاہی کو تعلیم دیجاتی ہے کہ وہ دورانِ جنگ میں کم سے کم غذا پر زندگی بسر کرے، چنانچہ چاول کے آٹے کا صرف ایک کلچہ ۲۴ گھنٹے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں غذا کے لئے رسد رسانی کا سوال بھی بہت ہلکا ہوجاتا ہے۔

فوجی تربیت بالکل مغربی اُصول پر ہوتی ہے اور بہت سخت محنت کا عادی بنا دیا جاتا ہے، چنانچہ سالانہ فوجی مظاہروں میں جو سال میں دو بار (نہایت سخت گرمی اور سردی کے زمانہ میں) ہوتے ہیں اگر کوئی سپاہی گر پڑتا ہے تو اس کو اسی حالت میں چھوڑ دیا جاتا ہے اور کوئی ہمدردی اس کے ساتھ نہیں کیجاتی، کیونکہ ایسے سپاہی کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر رہا اور اس لئے اسے زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

ایکبار وہاں نہایت سخت برفباری ہو رہی تھی۔ فوج کے کمانڈر نے سوچا کہ اس سے بہتر موقعہ فوجی آزمایش کا نہیں ہوسکتا، اس لئے اس نے کوچ کا حکم دیدیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے آدمی مر گئے، لیکن پبلک یہ سنکر بہت خوش ہوئی اور اس نے کمانڈر کی بہت تعریف کی۔

جاپان میں معمولی معمولی باتوں پر جان دیدینا روز کا مشغلہ ہے، وہ موت سے ڈرنا جانتے ہی نہیں اور بادشاہ کے لئے قربان ہوجانا اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں، انکا فلسفہ یہ ہے کہ خودکشی کرلینا، شکست سے زیادہ باعزت بات ہے اور اسی لئے وہ میدانِ جنگ میں نہایت بے جگری کے ساتھ لڑتے ہیں۔ جب کوئی نیا رنگروٹ بھرتی ہوتا ہے تو ایک مذہبی تقریب منائی جاتی ہے۔ سارا خاندان بہترین کپڑے پہن کر جمع ہوتا ہے اور سب ملکر رنگروٹ کو بارک تک لیجاتے ہیں، یہاں ایک افسر ان سب کی پذیرائی کرتا ہے اور رنگروٹ کو جب وردی پہنا کر سامنے لاتا ہے تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔

یہی مذہبی عقیدہ ہے جس کی بدولت وہاں کی پبلک اپنے نوجوانوں کو خوشی سے فوجی خدمت کے لئے بھیج دیتی ہے اور یہی معاشرت کی سادگی ہے جو جاپانی سپاہی کو تیزی سے آگے بڑھنے اور مصائب برداشت کرنے میں مدد دیتی ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ ان کے آلات حرب بھی بہت سُبک ہیں اور ان کی نقل و حرکت کے لئے بڑی بڑی سڑکوں کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ جنگلوں اور چھوٹے چھوٹے راستوں سے بھی بہ آسانی گزر جاتے ہیں۔ الغرض جاپانی فوج اس میں شک نہیں بڑی خطرناک چیز ہے، اور اگر ہم اس قوم کی اخلاقی خصوصیات پر نگاہ ڈالیں تو اتنی ہی گھنونی بھی ہے۔ یہ خیال کرنا کہ وہ ہندوستان یا کسی اور ملک پر صرف اس لئے حملہ کر رہے ہیں کہ اس ملک کو آزاد کرائیں گے غلطی ہے، اگر وہ آزادی کے ایسے ہی طرفدار ہیں تو انھوں نے چین پر کیوں حملہ کیا، منچوکو کو کیوں فتح کیا، منگولیا کی آزادی کیوں چھینی۔

"شہوانیات" (مصنفہ نیاز فتحپوری) کا دوسرا اڈیشن

جو نظر ثانی کے بعد مقبول عام سائز پر نہایت عمدہ کاغذ پر بہترین طباعت کے ساتھ مجلد شایع ہوا ہے۔ قیمت علاوہ محصول تین روپیہ

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ، جو عرصہ ہوا ختم ہوگیا تھا اب دوبارہ شایع کیا گیا ہے اور کاغذ و طباعت میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔ قیمت ۸ر

منیجر نگار لکھنؤ

سوچ

(ایک نفسیاتی مطالعہ)

تھکا ہوا سورج دھیرے دھیرے مغرب کی طرف چلا جا رہا تھا، تھکا ہوا سرد دن آہستہ آہستہ اپنے کو ایک سیاہ کمبل میں لپیٹ رہا تھا، دھواں اور کہرا رینگ رینگ کر غنودگی کے عالم میں مکانوں کی سوئی چھتوں پر پھیل رہا تھا۔ بجلی کے بہت سے قمقمے گردن جھکائے چپ چاپ سڑک سے گزرنے والوں کو اپنی دھندلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، گرد میں اٹے ہوئے درخت نم آلود پتیوں کو لٹکائے ہوئے دم بخود کھڑے تھے، دن بھر کی سرگرمیوں میں ایک اضمحلالی کیفیت سی آچلی تھی۔ زندگی میں ایک عجیب رکاؤ اور دھیما پن سا پیدا ہو چلا تھا۔ ایک ٹھنڈی۔ افسردہ۔ لڑکھڑاتی ہوئی سی لہر چاروں طرف دوڑ رہی تھی۔ یکے، تانگے، موٹر، پیدل چلنے والے بظاہر سب نہایت تیزی سے گزر رہے تھے مگر سب کی رفتار میں ایک خوابناکی سی پائی جا رہی تھی، سواریوں اور راہیوں کا شور و غل، قہقہوں اور کبھی کبھی گانے کی آواز فضا کو ذرا دیر گرما دیتی اور ایک اُداس سہانے پن کا، احساس دلاتی ہوئی گزر جاتی مگر اس سہانے پن میں وہی کیفیت ہوتی جو ڈوبتے ہوئے دن میں پائی جاتی ہے — اندھیرا لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

سڑک کے کنارے ایک مکان کے چھوٹے سے کمرہ میں لالٹین دھیمی دھیمی جل رہی تھی جس کی بتی کم کر دی گئی تھی۔ میز پر کہنی ٹکائے کرسی پر کوئی بیٹھا ہوا تھا، لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس کا چہرہ دھندلا دھندلا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ گال پر رکھے ہوئے تھے، سامنے کتاب کھلی ہوئی تھی مگر اس کی آنکھیں کمرہ کے ایک تاریک گوشہ میں جمی ہوئی وہاں نہ معلوم کیا دیکھ رہی تھیں — کمرہ کی سوگوار اور دھندلی فضا، خاموشی اور تنہائی بے حس و حرکت ایک انسانی ڈھانچہ، دو کبھی کبھی خوابناک آنکھیں، دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خود اس کا احساس دھیرے دھیرے سرد ہوتا چلا جا رہا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد اس ڈھانچہ میں حرکت ہوئی، اُس نے آہستہ سے ہاتھ اُٹھا کر بالوں کو پیچھے کی طرف کیا اور پھر بتی ذرا تیز کر دی۔ کمرہ میں روشنی یوں پھیل گئی جیسے یکایک متفکر دماغ میں کوئی خیال آجائے۔ اب اس کے خال و خد صاف نظر آنے لگے، وہ سانولے رنگ کا چوبیس پچیس برس کا ایک دبلا پتلا نوجوان تھا۔ چہرہ پر پھیکا پن۔ بال بکھرے ہوئے۔ گال ذرا پچکے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور ان میں ایک لایعنی سی چمک۔ اس نے کتاب کے صفحے پر اُچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر ورق گردانی کرنے لگا، کبھی دو چار ورق پیچھے اُلٹ دیتا اور کبھی دو چار ورق آگے۔ اسکے چہرہ سے ٹپک رہا تھا کہ وہ محض شغلاً یہ کر رہا ہے۔ اس کی آنکھیں کتاب کے صفحات پر ہوتے ہوئے بھی ان پر نہیں تھیں —— آخر کار اس نے کتاب بند کر دی اور پھر سامنے دیکھنے لگا۔ وہ کرسی پر اس طرح بیدم ہو کر بیٹھا ہوا تھا جیسے اپنے جسم سے بیزار ہے۔ اس کے ہاتھ پیر سب ڈھیلے پڑے ہوئے تھے گو ان سے عملی قوتیں سلب کر لی گئی ہیں —— سامنے دیکھتے دیکھتے جب وہ اُکتا گیا تو اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ میز پر ایک کاغذ پڑا ہوا تھا جس پر گئی جگہ اس کے نام لکھے ہوئے تھے اس نے غیر ارادی طور پر جیب سے قلم نکال کر اپنا نام لکھنا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی وہ محض لکیریں ہی کھینچتا رہ جاتا۔ اُن تمام باتوں کے باوجود بھی وہ اِن سے قطعاً غیر متعلق تھا۔ وہ نہ معلوم کہاں تھا۔ اُس کی کھوئی ہوئی آنکھیں بدستور کھوئی ہوئی تھیں۔ اس کے دماغ میں شاید کوئی خیال نہ تھا۔ مگر پھر بھی وہ نہ جانے کس خیال میں ڈوبا ہوا تھا وہ پھر آہستہ آہستہ بالوں کو اُنگلیوں سے گھمانے لگا یہاں تک کہ وہ اس سے بھی گھبرا گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں ایک دوسرے سے ملا لیں اور چٹ چٹ انگلیاں توڑنے لگا۔ پھر جمائی لی اور کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ کھونٹی سے گرم کوٹ اُتار کر پہنا۔ لالٹین دھیمی کی اور کمرہ سے نکل کر سڑک پر ٹہلنے لگا۔

سردی اب تیز ہو چلی تھی۔ سڑک پر آمد و رفت بھی نسبتاً کم پڑ گئی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے اس کے پیر دکھنے لگے مگر وہ ٹہلتا ہی گیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ صرف ایک سگریٹ رہ گیا تھا۔ ذرا سے توقف کے بعد وہ جلا کر پینے لگا۔ اب واقعی اس کے دماغ میں کچھ اُلجھے اُلجھے خیالات چکر لگا رہے تھے۔ مگر وہ انھیں سلجھانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ وہ دماغ پر زیادہ زور دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اور نہ ان خیالات کو صاف طور پر سمجھنا ہی چاہتا تھا۔ اُس میں اتنی سکت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ دس پندرہ منٹ ٹہلنے کے بعد وہ پھر کمرہ میں چلا آیا۔ لالٹین تیز کی اور چارپائی کے پاس کرسی کھینچ کر اس پر رکھ دی۔ کوٹ اُتار کر اس نے میز پر پھینک دیا اور چارپائی پر لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ وہ بالکل ساکت لیٹا ہوا تھا مگر اس کے سکون سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے اس میں جھلاہٹ بھری ہوئی ہے۔ ایک عجیب بے چینی اور انتشار اسکی رگ رگ میں پنہاں تھا۔ اُس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ سرہانے سے ایک رسالہ اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس کو وہ کئی بار دیکھ چکا تھا اور اب اس رسالہ میں اسکے

۔ ذکوئی جاذبیت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ مگر پھر بھی وہ اُسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اُس کی نظر ایک تصویر پر جم کر رہ گئی۔

یہ ایک عورت کی تصویر تھی جس کو شاید اس سے قبل اس نے دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ مگر آج وہ اس تصویر کو غور سے دیکھ رہا تھا اُس کی نگاہیں عورت کی ہنستی ہوئی آنکھوں پر جمی ہوئی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے سے نہ معلوم کیا خیال آیا کہ وہ تصویر کو ترچھا کر کے دیکھنے لگا۔ کبھی وہ اس کو دائیں طرف لیجاتا کبھی بائیں طرف۔ کبھی دور لیجاتا اور کبھی قریب لاتا مگر جس زاویہ سے بھی وہ تصویر کو دیکھتا عورت کی آنکھیں اسے اپنی ہی طرف دیکھتی معلوم پڑیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی بہت سی تصویریں وہ یوں دیکھ چکا تھا اور قریب قریب سب میں اس نے یہی بات پائی تھی مگر اس وقت وہ اس میں خواہ مخواہ دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ اسی طرح جی بہلا رہا تھا کہ دروازہ پر قدموں کی آہٹ آئی اور تقریباً اسی کی عمر کا ایک نوجوان داخل ہوا۔

"کہو کیا ہو رہا ہے؟" آنے والے نے پوچھا

"کچھ نہیں اسی رسالہ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا ـــــ کہاں سے آرہے ہو؟"

"گھر سے ـــــ پڑھائی وڑھائی شروع کی کہ نہیں؟"

"ہاں، یہاں لڑکوں کو پڑھانے سے تو فرصت ملتی ہی نہیں تمہیں پڑھائی کی سوجھی ہے!"

"ارے بھئی تو صبح کو پڑھاتے ہو کہ شام کو؟"

"نہ صبح نہ شام!" لہجہ میں جواب نہ دینے والی کاہلی کا انداز شامل تھا۔

"کیا مجہول قسم کی باتیں کر رہے ہو ـــــ سگریٹ ہے؟"

"نہیں۔ ایک تھا پی گئے۔ اب کھانا کھانے کے بعد دوکان پر چل کر پئیں گے"

"کتنی دیر میں آئے گا کھانا؟"

"بس اب آتا ہی ہوگا، گھر کے لوگ کھا چکے ہوں گے"

اس مختصر سی گفتگو کے بعد دونوں چپ چاپ بیٹھ گئے جیسے ان کے پاس کوئی اور موضوع نہیں رہ گیا ہے جس پر باتیں کریں۔ گویا وہ دونوں کو ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس نہیں ہے کمرہ میں بالکل سکوت طاری تھا جو ذرا دیر بعد حسب امید سوال پر ٹوٹا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ تو نہیں"

"آخر؟" محض باتیں کرنے کی خاطر باتیں ہو رہی تھیں۔

"یہی کہ کھانا ابھی تک نہیں آیا"

"یا یہ کہ دُنیا میں کتنے غم ہیں"

"ہٹاؤ کہاں کی بات نکالے ہوئے ہو تم بھی!" اتنے میں ملازم کھانا لیکر آگیا "آج بڑی دیر لگائی بھئی تم نے!" گویا اس سے زیادہ اور کوئی دلچسپی وہ ملازم پر نہیں رکھتا تھا۔

"ارے صاحب بغیر سرکار کو کھلائے کیسے لاتے۔ اور ہاں ماسٹر صاحب سرکار نے کہا ہے کہ آپ کی تنخواہ پرسوں ملے گی"

"خیر ـــ!" اس نے لاپرواہی سے کہا جس میں ملازم کے مقابلہ میں اپنے ذاتی وقار کی خفیف سی نمایش بھی شامل تھی۔ "آؤ بھئی کھانا کھاؤ"

"بسم اللہ کیجئے" اور وہ اس مختصر اور کم مقدار کھانے سے نظر ہٹا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

کھانے کے دوران میں بالکل خاموشی تھی۔ دونوں اپنے اپنے خیال میں محو تھے ـــــ کھانے سے فارغ ہو کر دونوں سگریٹ لینے چلدئے۔ راستے میں بھی دونوں چپ تھے۔ وہ زبان کھولتے ہوئے ایک بار سا محسوس کر رہے تھے۔ ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اس خاموشی کو توڑیں جیسے وہ ڈرتے تھے کہ اس کے بعد جو کچھ باتیں ہوں گی وہ انہیں اور بے کیف اور پژمردہ بنا دیں گی اُنھیں اپنے وجود کے بیکار ہونے کا احساس دلا دیں گی سگریٹ خریدنے کے بعد دونوں آہستہ آہستہ گھر کی طرف لوٹے پاس ہی کہیں سے گھنٹہ بجنے کی آواز آنے لگی انھیں ایسا معلوم ہوا کہ ایک دوسری آواز ان کے دماغ کی بے اثر اور ٹھہری ہوئی آواز کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ انھیں

جھنجھوڑ کر جگا رہی ہے۔ دونوں دل میں گھنٹے کو گن رہے تھے۔

"ایک — دو — تین — چار — پانچ — چھ — سات — آٹھ — نو — دس سے آخری گھنٹہ بولا اور انھوں نے ایسا محسوس کیا دونوں میں سے ایک کو اب بولنا چاہئے

"نو بجے ہیں — ماسٹر صاحب!" ماسٹر صاحب کو کھینچ کر ادا کیا گیا۔

"ہاں"

"لڑکیاں انگریزی سینما دیکھ کر واپس ہو رہی ہوں گی۔ ذرا اور رک کر چلو"

"فایدہ؟"

"گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی"

"جی ہاں سردی میں جان دینا ہے"

"جیسے اتنی دیر میں جم ہی تو جائیں گے آپ"

دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آنے لگی۔ سینما سے لوگ لوٹ رہے تھے۔ آواز قریب آتی گئی۔ ایک ٹانگا پاس سے ہو کر گزر گیا۔ اس پر صرف مرد ہی تھے۔

"لاحول ولاقوۃ"

ایک اور ٹانگے کی بھی آواز سنائی دینے لگی۔

"اس پر ضرور ہوں گی۔ میرا دل کہہ رہا ہے"

یہ ٹانگا بھی تیزی سے گزر گیا۔ چند نرم و نازک ہلکے پھلکے قہقہوں کی آواز فضا میں گونج کر رہ گئی۔ دونوں ٹانگے کو مڑ کر دیکھنے لگے بجلی کے دوسرے کھمبے کے پاس پہونچ کر ٹانگے پر ذرا روشنی پڑی انھوں نے دیکھا تین لڑکیاں آپس میں گفتگو کرتی ہوئی چلی جا رہی تھیں۔ دو کو وہ صاف طور پر نہیں دیکھ سکے۔ مگر ایک پر روشنی زیادہ پڑ رہی تھی۔ اس کا چہرہ انھوں نے صاف طور پر دیکھ لیا ایک عجیب لاحاصل سا احساس حسن ان میں جاگ اٹھا۔ اگلی آنے والے ٹانگے پر وہ پہلے ہی سے متوجہ ہو گئے۔ اس پر کی سواریوں کو انھوں نے اچھی طرح دیکھا۔ واقعی بہت خوبصورت لڑکیاں تھیں۔

"دیکھا تم نے! مگر دوست ان میں سے کوئی بھی تمھیں پوچھنے والی نہیں۔ تم ہوا کرو قابل اور حساس۔ جب تک تم چند روپیوں کے واسطے یہاں ٹکے ہوئے پڑھا رہے ہو تم ماسٹر صاحب ہی کہے جاؤ گے۔ تمھاری دماغی قوتیں سو جائیں گی۔ کیا تم خود نہیں محسوس کرتے کہ تم میں وہ اگلی سی چمک نہیں رہی۔ تم دن کا بیشتر حصہ معمولی معمولی باتیں سوچنے میں گزار دیتے ہو۔ تمھاری گفتگو بدمزہ اور پھیکی ہونے لگی ہے" وہ رو میں کہتا چلا جا رہا تھا جیسے وہ خود اپنے دل کا بخار نکال رہا ہے۔ اس نے پھر خطابت شروع کر دی "کون جانتا ہے کہ تمھارے پاس اتنا بیدار دماغ۔ اتنا پر خلوص دل۔ اتنے لطیف جذبات ہیں۔ تم سے بھلا کس کو محبت ہو سکتی ہے کتنی غلط بنیادوں پر ہماری ازدواجی زندگی قایم ہے۔ جانتے ہو زندگی کا سب سے المناک پہلو کیا ہے — آیں! آیں!"

"اوں!" وہ چونک پڑا "کس کا سب سے المناک پہلو!"

کوٹھری آ گئی دونوں لحاف اوڑھ کر چارپائی پر بیٹھ گئے

"زندگی کا سب سے المناک پہلو!" اس نے دہرایا اور پھر سوچ میں پڑ گیا

"ہاں کیا ہے؟"

"شاید یہی سوچتے رہنا کہ کیا کرنا چاہئے"

"اور تنہائی؟"

"تنہائی!" اس نے دھیرے سے کہا اور اپنی چھوٹی سی کوٹھری میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اُسے ایک دم سے تنہائی کا احساس ہونے لگا اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے چلتے چلتے یکایک اس کی نبضیں رک گئی ہیں جیسے ساری دنیا اچانک سونی ہو گئی ہے اور وہ تن و تنہا تاریک اور مبہم خلاؤں میں سانس لے رہا ہے۔ گھبرا کر چاروں طرف دیکھ رہا ہے مگر اسے کوئی نظر نہیں آ رہا ہے — وہ تنہا ہے — بالکل تنہا۔ وہ کسی کو دیکھ رہا ہے نہ اسے کوئی دیکھ رہا ہے — اُسے کوئی بھی نہیں دیکھ رہا ہے —

اف! کتنا خوفناک احساس! اسے کوئی بھی نہیں دیکھ رہا ہے! وہ ٹھٹھرنے لگا۔ اسے سردی لگنے لگی۔ اس کے تمام بدن میں ہلکی سی کپکپی پیدا ہو چلی۔ اس کے دوست نے اسے پھر خواب سے چونکایا۔ "سنا تم نے! تنہائی! زندگی کا سب سے المناک پہلو تنہائی ہے اور اس کی بھی وجہ یہی غلط قسم کی ازدواجی زندگی ہے۔ ہماری زندگی کی ساری مسرتیں سارا حوصلہ فنا ہو جاتا ہے۔ ہم بہت جلد بے روح ہو جاتے ہیں۔ اگر عورت اچھی ہے تو اسے مرد اچھا نہیں مل رہا ہے اگر مرد اچھا ہے تو اُسے مناسب عورت نہیں مل رہی ہے دونوں میں سے کسی کو بھی حسب خواہش ساتھی نہیں ملتا۔"

"اتنا میری طرف سے اضافہ کر دیجئے اگر دونوں مل بھی گئے تو پھر روپیہ نہیں ملتا کہ ان دونوں کو متحد کر سکے" اور اس نے پھر اپنی چھوٹی سی کوٹھری میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوٹھری بھی اُسے بار بار دیکھ رہی ہے۔ دونوں پھر چپ ہو گئے۔

"آخر تم چپ کیوں ہو جایا کرتے ہو" اس کے دوست نے خاموشی سے اکتا کر پوچھا

"اس قسم کی باتوں کا لازمی نتیجہ خاموشی کے سوا اور کیا ہے" اس نے گردن اس کی طرف پھرا کر جواب دیا اور ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر دوڑ گئی۔

اس کے بعد موضوع بدل گیا۔ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر اس کا دوست اپنے گھر چلا گیا ـــــ وہ چارپائی پر یونہی گم سم بیٹھا رہا۔ اس کے دماغ میں پھر کوئی خیال نہیں رہ گیا تھا۔ اور وہ پھر بیکاری محسوس کر رہا تھا کبھی وہ لالٹین تیز کر دیتا اور کبھی دھیمی۔ اس کے چہرہ پر کبھی اُجالا دوڑ جاتا اور کبھی تاریکی ـــــ وہ بالکل خالی الذہن بیٹھا ہوا تھا مگر اس کی آنکھیں برابر چمک رہی تھیں ـــــ ایک اُداس، بے حس چمک! ـــــ باہر رات اور زیادہ سرد اور بے جان ہو چکی تھی۔ اُس نے پھر وہی رسالہ اُٹھا لیا۔ اُس کی نظر پھر اُسی عورت کی تصویر پر پڑی جو اُسے برابر دیکھے جا رہی تھی۔ وہ تصویر کو اور غور سے دیکھنے لگا۔ اُسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے عورت کے لبوں میں جنبش ہونے والی ہے اور وہ کچھ بولنا ہی چاہتی ہے۔ وہ تصویر کو اور قریب لا کر دیکھنے لگا ـــــ اُسے کچھ اور معلوم ہونے لگا جیسے عورت کی ہنستی ہوئی آنکھوں میں پانی بھر آیا ہے۔ اور وہ گردش کرنے ہی والی ہیں" اُس نے اپنی آنکھوں کو چھوا خود اُس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں "کیا حماقت ہے بیٹھے بیٹھے! کوئی بات نہیں اور خواہ مخواہ افسردہ ہوتا چلا جا رہا ہوں" اُس نے رسالہ رکھ دیا۔ مگر رفتہ رفتہ وہ پھر سوچنے لگا۔ "زندگی اور تنہائی! تنہائی اور بیکاری! آخر یہ سب کیوں ہے؟ میں تنہا کیوں ہوں۔ میرا دل کتنی محبت کر سکتا ہے مگر مجھ سے کوئی محبت نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔ مجھے تنہا ہی رہنا پڑے گا۔ اور میں رہوں گا بھی تنہا۔ مگر کیا واقعی ہمیشہ تنہا رہوں گا ـــــ ہمیشہ تنہا!" اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں بند کر لیں ـــــ سامنے لالٹین جل رہی تھی ـــــ مگر وہ بالکل تاریکی میں تھا ـــــ تھا تاریکی! ـــــ زندگی کی بھیانک۔ خاموشی۔ انجان تاریکی! جس میں صرف خیالات چکر لگایا کرتے ہیں۔ جہاں عدم و وجود گھل کر ایک ہو جاتے ہیں ـــــ وہ آنکھیں یونہی بند کئے بیٹھا تھا ـــــ سامنے لالٹین اسی طرح جل رہی تھی۔ بہت دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ لالٹین مدھم ہو رہی تھی۔ شاید تیل ختم ہو رہا تھا۔ اس نے لالٹین گل کر دی۔ کمرہ میں کامل اندھیرا چھا گیا۔ جس میں وہ بالکل گم ہو کر رہ گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ زمین آسمان کچھ بھی نہیں رہ گئے ہیں ـــــ صرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور اس میں لیٹا ہوا وہ آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا ـــــ اور شاید سوچ رہا تھا ـــــ یا شاید ـــــ مگر اس کی آنکھیں اندھیرے میں کون دیکھ سکتا تھا!

مجتبیٰ حسین

"نگار"

جنوری فروری ۱۹۴۱ء اور جنوری فروری ۱۹۴۲ء

یہ دونوں پرچے آپ کے پاس ہیں یا نہیں - اگر نہیں ہیں تو اب طلب فرمائیے یا ان میں سے کوئی ایک ہے اور دوسرا نہیں، تو دوسرا بھی منگا لیجئے، ورنہ ایک وقت آئے گا کہ مومن نمبر، ظفر نمبر، اُردو شاعری نمبر کی طرح یہ دونوں نمبر بھی کسی قیمت پر نہ مل سکیں گے۔ ان دونوں نمبروں کی اہمیت کا اندازہ اگر آپ اس وقت نہ کریں گے تو بعد میں کریں گے، لیکن یہ وقت وہ ہوگا جب آپ انھیں حاصل نہ کر سکیں گے۔

منیجر نگار

سیماب صاحب اور شیطان

جناب سیماب اکبرآبادی نے شیطان کے متعلق ایک نظم "موحد اعظم" کے عنوان سے لکھی۔ کسی رسالہ میں شایع ہوئی۔ اس کو پڑھکر کوئی مولوی صاحب برافروختہ ہوئے اور انھوں نے تردید لکھ دی۔ ایک شاعر صاحب کو جوش آیا، انھوں نے جواب میں ایک نظم چھپوادی، سیماب صاحب کے دوستوں نے یہ ہنگامہ دیکھ کر نظم کی مدح سرائی شروع مخالفوں کو جلال آیا، انھوں نے اعتراض سرد کردئے۔ لیکن ان میں سے کسی نے نہ نظم کو جانچا، نہ مضمون پر غور کیا، نہ زمانہ و ماحول کو دیکھا، نہ سیماب صاحب کو سمجھا۔

(۱) اس نظم (موحدِ اعظم) کا فنِ شاعری میں کوئی مرتبہ نہیں ہے اور خود سیماب صاحب کے کلام میں بھی یہ کوئی شہپارہ نہیں۔ انھوں نے اس سے بہتر نظمیں کہی ہیں نظم نہایت معمولی، چلتی ہوئی صرف لکھنے کے لئے لکھدی ہے۔

(۲) "موحدِ اعظم" میں شاعری کی غلطیاں موجود ہیں۔ جو سیماب صاحب سے بعید تھیں۔ الفاظ غلط نظم ہوئے ہیں اور بے اصول ساخت کئے گئے ہیں۔ ترکیب و بندش میں سستی دکھائی دی ہے، مضامین غلط ہیں۔ شاعر کی نظر نظم کے نفس موضوع تک نہیں پہونچی، اس لئے نظم بے اثر ہوگئی اور وہ "سخن گسترانہ بات" آپڑی۔ مختصر تفصیل ملاحظہ ہو:-

(۳) نظم کے دوسرے شعر کا پہلا مصرع ہے:- "فرشتوں کا معلم، عالم ملکوت کا عالم"

اس میں (ملکوت) بسکون ثانی نظم ہوا ہے یہ غلط ہے۔ (ل) پر زبر ہونا چاہئے۔ ایک اور مصرع ہے:- "خدا کے ساتھ "آعوذ" میں استحکام ہے اسکا"

یہاں آعوذ (مد کے ساتھ) پڑھنے سے مصرع موزوں ہوتا ہے، جہلاء آعُوذ کہا کرتے ہیں۔ اصل صیغہ بغیر مد کے ہے۔ یہ بجائے خود شاعر کا ضعف نظم ہے اور یہاں اس لئے زیادہ ہوگیا کہ اس بحر میں بغیر مد کے نظم ہو سکتا ہے۔ مثلاً اس طرح کہہ سکتے ہیں:- "خدا کے ساتھ اعوذ میں بھی استحکام ہے اس کا"

تیسری جگہ سیماب صاحب فرماتے ہیں:- "سرشتا تجھکو ہونی چاہئے شیطان سے نفرت"

فارسی لفظ (سرشت) پر عربی کی تنوین بھی سیماب صاحب کے قلم سے عجیب ہے یہ بھی جاہلوں کا انداز آ ہوگیا ہے۔

(۴) سیماب صاحب یہ آمیزش عربی و فارسی اور جگہ بھی کرچکے ہیں۔ رسالہ چندستان دہلی بابت مارچ ۱۹۴۱ء میں اپنے مضمون (شاعر حیات) کے صفحہ ۳۹ پر تحریر فرمایا ہے

"وضع قدیم کے پابند جوان العمر رئیس تھے"

اس حساب سے ان کے نزدیک "قریب المرگ" بھی جایز ہوگا۔ یہاں زبان کی صحت اور معیار کی بحث آجاتی ہے۔ یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ سیماب صاحب کی غلطی مستند مان لی جائے اور یہی قانون بن جائے۔ سیماب صاحب جیسے شاعر یہ آزادی اختیار کریں گے تو زبان کو بگڑتے کچھ دیر نہ لگے گی۔

(۵) سیماب صاحب کی اسی نظم کا ایک مصرع یہ ہے:- "اُدھر یہ ضد کہ ہو مسجود خاکِ آدمِ اُولیٰ"

سیماب صاحب کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ اُولیٰ مونث ہے اور اوّل الذکر آدمِ اوّل کہنا چاہئے تھا۔ یہ غلطی سیماب صاحب سے ہونے کی نہ تھی۔

(۶) سیماب صاحب فرماتے ہیں:- بذہنِ عشق حکم سجدۂ آدم نمی گنجد

یہ "ہندوستانی فارسی" ہے، ایرانی اسلوب کو اس سے کچھ تعلق نہیں — بہتر ہوتا کہ یہ مضمون بھی اُردو میں لکھ دیتے۔

(۷) ایک جگہ لکھتے ہیں:- کبھی ہیں کعبۂ مسجود دروازے قیادت کے

یہاں یہ غلطیاں ہیں:- (۱) "کعبۂ مسجود" نامانوس ترکیب ہے۔ (۲) کعبہ کبھی مسجود نہیں ہوتا۔ (۳) "کعبۂ مسجود" کہنے سے پہلے مصرع کے مقابلہ میں کوئی جدت ترقی اور بلندی پیدا نہیں ہوئی۔ (۴) اگر اختراع سے کام نہ لیتے اور وہی قدیم لفظ "کعبۂ مقصود" رکھدیتے، تو مصرع کہیں سے کہیں پہونچ جاتا۔ یہ شعر یوں ہوتا:-

کبھی سجدے ہیں تیرے آستانے پر حکومت کے — کبھی ہیں کعبۂ مقصود دروازے قیادت کے

"کعبۂ مقصود" کہنے سے "کعبہ" میں پہلے مصرعہ کا مضمون سجدہ بھی آگیا۔ اور مقصود کے مضمون کا اضافہ بھی ہوگیا۔

(۸) سیماب صاحب نے اس نظم میں ذوق کا ایک شعر اس طرح تضمین کیا ہے:۔

وہاں اک ترکِ سجدہ سے ہوئی یہ برہمی پیدا — قضا کتنے ہوئے ہیں تیرے سجدے کر حساب ان کا
گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے — اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

(۱) تضمین کرنے کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ وہ شعر گویا اپنا کر لیا جائے۔ اس کا مضمون اپنی نظم میں کھپا لیا جائے۔ یہاں یہ بات نہیں ہے۔

(۲) ذوق کے پہلے مصرع میں اظہار واقعہ ہے اور دوسرے میں اس کی تائید سیماب صاحب جب اوپر سے شیطان کی تحسین کر رہے ہیں، تو اسکے لعین و رجیم ہونے کی تائید موزوں نہیں، جو ذوق کے مصرعۂ ثانی کا مفہوم ہے صرف پہلا مصرع کھپ سکتا ہے۔

(۳) ذوق کا شعر بے جگہ رکھا گیا ہے۔ اس سے اوپر سیماب صاحب کا جو شعر ہے، اس کے صرف پہلے مصرعہ سے ذوق کا شعر متعلق ہے یعنی ترکِ سجدہ سے یہ برہمی پیدا ہوئی کہ شیطان مارا گیا۔ دوسرے مصرع سے کوئی میل نہیں ہے۔ مصرعوں کی ترتیب بدل کر اس طرح تضمین درست و بامعنی ہو سکتی تھی۔

قضا کتنے ہوئے ہیں تیرے سجدے، کر حساب ان کا — وہاں اک ترکِ سجدہ سے ہوئی یہ برہمی پیدا
گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے — اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

(۹) سیماب صاحب نے مرزا داغ کا یہ شعر بھی اپنی نظم میں چسپاں کیا ہے:۔

تمھیں چاہوں، تمھارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں — مرا دل پھیر دو، مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا

داغ کا یہ شعر ان کے عامیانہ شعروں میں ہے، جس میں بوالہوس عاشقوں کا جذبہ و معاملہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کو ظرافت کے موقعہ پر بطور ضرب المثل کے لکھ سکتے ہیں اس لئے نظم میں اس شعر کے آنے سے نظم کا توازن اور لہجہ بدل گیا (جس کو انگریزی میں ٹون کہتے ہیں)

(۱۰) شعرائے متصوفین کو شیطان کے انکارِ سجدہ میں ایک بات سوجھی۔ لیکن وہ صرف تصوف کا ایک نکتہ اور شاعری کا ایک لطیفہ تھا، اس لئے صوفی شاعروں نے اس کو صرف مثال و نکتہ کی حد تک رکھا۔ چنانچہ کسی کی رباعی ہے:۔

جعفر سخن از کعبہ و از دیر مگن — در وادیِ شک چو گمرہان سیر مکن
رو شیوۂ بندگی ز شیطان آموز — یک قبلہ گزیں و سجدۂ غیر مکن

ایک شاعر بے نماز مسلمان کا شیطان سے مقابلہ کرتا ہے:۔

شیطاں ہزار مرتبہ بہتر ز بے نماز — آں سجدہ پیشِ آدم و ایں پیشِ حق نکرد

ان سب سے بڑھکر حضرت خواجہ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مشہور قصیدے میں شیطان کے متعلق ایک لطیفہ اور معرفت کا ایک نکتہ بیان کیا ہے یہ مضمون ۲۰ شعروں میں لکھا ہے۔ اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

روزے از روزہا کلیم اللہ، — خواست مرشد ز ایزدِ داور
شد ندائے برائے او کہ برو — پیشِ ابلیسِ مفسداں سالار

یعنی ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالےٰ سے اپنے لئے ایک ہادی و مرشد طلب کیا۔ ندا آئی کہ مفسدوں کے سالار ابلیس کے پاس جاؤ۔ چنانچہ حضرت موسیٰ شیطان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ مجھے اللہ تعالےٰ نے تیرے پاس بھیجا ہے۔ تجھ سے ارشاد ہدایت چاہتا ہوں۔ "خواہم من از تو ارشادے"۔ اس کو ابلیس نے جس طرح سنا اور جو کچھ کہا۔ اس کو خواجہ عطار نے اس طرح ادا کیا ہے کہ وہ اشعار قصیدہ کے شہ پارے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

زیں سخن ہمچو شعلہ سر بچید — جست و بر جانشست ہمچو شرار
گفت من از دمِ ازل دارم — طوق لعنت بہ گردنِ ادبار

تو کلیم اللّٰہی ، نداری ننگ — تو ندیم اللّٰہی ، نداری عار
کہ زمن چشم داری ایں معنے — کہ بمن برنویسی ایں طومار
من کجا و طریقِ ایں احکام — من کجا و سبیلِ ایں اطوار
من پلنگم ، پلنگِ عصمت خوار — من نہنگم ، نہنگِ پُر ادبار
راہ و رسم ضلالت از من پُرس — مفسداں را منم سپہ سالار

یعنی شیطان نے کہا کہ میری گردن میں تو ازل سے طوق لعنت پڑا ہوا ہے۔ مجھ کو ان باتوں سے کیا تعلق۔ مجھ سے تو راہ و رسم ضلالت و گمراہی پوچھ لو۔ لیکن حضرت موسیٰ نے پھر "زبان نیاز" سے اصرار کیا تو ابلیس نے "لب گوہر فشاں و شکر بار" کھولے اور

"من" مگو گفت - تا چو من نشوی — ایں سخن راز من بخاطر دار
یعنی اول چو من شوائے سرہ مرد — زخم اورا سپر بہ سینہ میار
چوں شدی ہمچو من، بروپس ازاں — ہر چہ خواہی بگو و باک مدار

یہ جواب دیا کہ جب تک مجھ جیسے نہ ہو جاؤ "من" نہ کہو، خودی کا دعویٰ نہ کرو، اول میری طرح میدان عشق میں اس طرح زخم کھاؤ کہ کبھی ڈھال کو سینہ کے سامنے نہ کرو۔ جب مجھ جیسے ہو جاؤ تو جو چاہو کہو۔

اس طویل قصے کا ماحصل بھی وہی رباعی کا مصرع ہے — "یک قبلہ گزیں و سجدۂ غیر مکن"۔ لیکن دیکھنے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ان تمام اسالیب بیان میں شیطان شیطان ہی کے درجہ پر رہتا ہے۔ کوئی شخص اس دھوکے میں نہیں پڑتا کہ ان بزرگوں اور شاعروں نے ابلیس کو موحد اعظم اور عارف کامل قرار دیا ہے۔ سیماب صاحب بھی حد کے اندر رہتے تو کوئی اعتراض نہ تھا۔ لیکن وہ فرماتے ہیں :-

خدا کے ساتھ آ عوذ میں استحکام ہی کیا — کلام اللہ میں سب سے زیادہ نام ہے اسکا

کلام اللہ میں صرف نام یا ذکر کا سب سے زیادہ آنا، کوئی مدح و ستایش نہیں ہے۔ ابلیس و شیطان کے نام اگر سیماب صاحب کے شمار کے مطابق سب سے زیادہ بھی ہوں، تو اس عنوان سے ہیں کہ شیطان (بقول مرزا غالب) یہ کہتا ہوگا :-

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ — ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

سیماب صاحب نے اپنے اس شعر میں شیطان کی مدح کرنی چاہی ہے۔ لیکن "ہجو ملیح" ہو گئی۔

(۱۳) یہ دعوے کہ "اردو شعرا میں آجتک کسی نے شیطان پر نظم نہیں لکھی" صحیح نہیں — ڈاکٹر اقبال کی تصانیف دیکھنے سے اس کی تردید ہوتی ہے۔

(۱) ضرب کلیم کے صفحہ ۴۲ و ۴۳ پر "تقدیر" کے عنوان سے ایک نظم ہے، جس میں ابلیس و یزداں کا مکالمہ ہے نظم کے نیچے لکھا ہوا ہے: "ماخوذ از محی الدین بن عربی" اس نظم میں اقبال نے مسئلۂ تقدیر کو حل کیا ہے، وہ نکتہ اور ایسا نادر اسلوب پیدا کیا ہے کہ یہ نظم حرز جاں بنانے کے قابل ہے۔ سیماب صاحب کی نظم کے تقریباً ۵۰ شعر ہیں، اور اقبال کے ۵۔ لیکن یہ پانچ اُن پچاس پر بھاری ہیں۔ (۲) ضرب کلیم ہی میں صفحہ ۱۴۸ پر دوسری نظم۔ "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" (۱) بال جبریل صفحہ ۱۹۲ پر ایک نظم ہے بعنوان "جبریل و ابلیس" (۴) بال جبریل ہی میں صفحہ ۲۱۵ پر "ابلیس کی عرضداشت" کے نام سے ایک نظم ہے۔ (۵) جاوید نامہ میں ایک نظم میں ابلیس کی مجلس شوریٰ دکھائی ہے۔ یہ اس قسم کی نظموں میں بہترین اور اختراع بدیع ہے۔

اقبال نے ان نظموں میں اور اسی قسم کی فارسی نظموں میں ابلیس کی فطرت کے مختلف پہلوؤں سے جو لطیف نکتے پیدا کئے ہیں اور جس اسلوب سے ان کو بیان کیا ہے وہ شعر و ادب کے لطائف و نوادر ہیں اور سیماب صاحب کی سطح فکر سے نہایت ارفع و اعلیٰ۔

(۱۴) جن علمائے کرام نے سیماب صاحب کی نظم پر اظہار خیال فرمایا، ان سے بھی مجھے عرض کرنا تھا، لیکن یہ مضمون میرے ارادہ و امید سے زیادہ طویل ہو چکا ہے اس لئے بہت مختصر گزارش کرتا ہوں کہ مذہبی نظر سے اس نظم کی اتنی طویل تنقید و تردید لاحاصل تھی۔ صحیح العقیدہ مسلمانوں کے خیالات پر سیماب صاحب کی نظم کا مطلق کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ ہر جاہل اور کم علم مسلمان بھی اس نظم کو سنکر لاحول پڑھے گا۔ ایسے لوگوں کے بہکنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اس لئے ان کو سمجھانے کی تکلیف ضروری

نہ تھی - دوسرا گروہ فاسد العقیدہ انقلاب پسند مسلمانوں کا ہے - وہ خدا کے انکار اور مذہب سے بیزاری میں آپ کے وعظ و تبلیغ کی حد سے بہت آگے بڑھ چکے ہیں، وہ آپ کے مضمون پر لاحول کے مترادف انگریزی الفاظ استعمال کریں گے - آجکل خدا اور مذہب سے بغاوت کی نظمیں نہایت کثیر و عام ہیں - ان نظموں کے اقتباس سے مضمون اور طویل ہو جاتا اس لئے ترک کرتا ہوں - ان کو بھی سمجھانا بیکار ہے - آپ اس ارشاد پر عمل کرتے ہیں کہ " فذکر انما انت مذکر "۔ لیکن یہ لوگ منافق ہیں کہ باوجود بیدینی کے اپنے آپ کو مسلمان کہلوانا چاہتے ہیں - اس لئے یہ بھی یاد رہے کہ :-

" ذالک بانہم آمنوا ثم کفروا فطبع علی قلوبہم فہم لا یفقہون "

(۱۵) اب رہے سیماب صاحب کے خاص شاگرد، تو ایک تلمیذ رشید کہتے ہیں :-

میری گستاخی معاف اے خالق فطرت کہ آج — تیرے قانون قضا سے کر رہا ہوں احتجاج

اور ایک طویل نظم میں موت کے خلاف احتجاج کر کے اس نتیجہ اور نصیحت پر نظم کو ختم کرتے ہیں :-

جبر ہی پر ہے اگر دار و مدار زندگی — تو یہ بہتر ہے کہ ہر انسان کرلے خودکشی (رسالہ شاعر جنوری ۱۹۳۵ء)

دوسرے شاگرد عزیز ایک طویل نظم کہتے ہیں - " اگر خدا ہے " - نمونہ کے طور پر دو شعر اس کے سن لیجئے :-

اگر خدا ہے تو کیوں نہیں اس کو اپنی دنیا کی فکر و پروا — ازل سے سویا ہے یوں کہ بیدار تا ابد اب نہ ہوگا گویا
اگر خدا ہے ترا یہی اے فرشتۂ نیک نام سن لے — حیات تک تو نہیں بنوں گا ترے خدا کا غلام سن لے

(رسالہ کنول آگرہ فروری ۱۹۳۷ء)

(۱۶) آخر میں خود سیماب صاحب کی سنئے - ان کو پیامی شاعر بننے کا دعویٰ ہے - چنانچہ ایک پیام دیتے ہیں :-

عشرت کی طرف نگاہ بھی میں نہ کروں — تو نغمہ سرا ہو، آہ بھی میں نہ کروں
نیکی نہیں ممکن ہے تو کیا اے ناصح — دنیا میں کوئی گناہ بھی میں نہ کروں

ہر جلوہ کہ داد خواہ ہے فطرت کا — اک عقیدۂ بے پناہ ہے فطرت کا
حیرت نہیں فطرت میں جو اسکی ہے گناہ — انسان خود اک گناہ ہے فطرت کا

سوچئے کہ ان رباعیوں میں کیا پیام ہے اور کیا دعوت عمل ہے اور غور کیجئے کہ دوسری رباعی میں شاعری کیا ہوئی اور شعری و ادبی نکتہ کیا نکلا اگر انسان کا گناہ فطرت ہونا کسی شاعرانہ توجیہ سے بھی ثابت کیا ہوتا تو کچھ بات پیدا ہو جاتی - اس کے مقابلہ میں کسی شاعر کی اس رباعی کی لطافت و شعریت دیکھئے :-

یہ بات نہیں کہ مے پرستی ہے گناہ — مٹ جائے خودی جس سے وہ مستی ہے گناہ
پھر چاہے کوئی گناہ بھی وہ نہ کرے — انساں کے لئے خود اسکی ہستی ہے گناہ

سیماب صاحب نے اس طرح کے پیام اور بھی دئے ہیں جن ضلالت اور کجروی کی قیادت نظر آتی ہے - اس کے علاوہ اولیاء اللہ کی توہین بھی جائز رکھی ہے انھوں نے اپنے رسالہ شاعر میں ایک مضمون شائع فرمایا تھا - جس میں اقبال کی خودی پر تنقید کی تھی - اس میں حضرت منصور، حضرت شبلی اور حضرت سرمد کی شان میں گستاخانہ الفاظ موجود ہیں چنانچہ ملاحظہ ہو :-

" خودی کے ایک معنی ہیں خود کو کچھ سمجھنا یعنی انانیت - اور یہ بھی شعار انسانی ہیں ایک شعار غیر مستحسن ہے منصور بن حلاج شبلی اور سرمد کو اگر سوسائٹی صوفی اور خداشناس کہکر خودی و خودنمائی کے گناہ سے بری کر دے تو فرعون، شداد اور ہامان وغیرہ خودنما انسانوں پر تعریض و تکفیر عرت عصبیت کا ایک مظاہرہ ثابت ہوتی ہے اور کچھ نہیں - ورنہ مسلک دونوں طبقوں کا ایک ہے "۔ (شاعر آگرہ ستمبر ۱۹۳۶ء)

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں نے محض تعصب سے فرعون و شداد و ہامان کو اولیاء الشیاطین مان رکھا ہے اور انھیں جیسے خودنما انسانوں منصور، شبلی و سرمد کو اولیاء اللہ میں شامل کر لیا ہے - نعوذ باللہ من ذالک !

یہ اعتراضات اس وجہ سے ہیں کہ سیماب صاحب کی طرف سے بار بار دعوے کیا جاتا ہے کہ وہ پیامی شاعر ہیں ان کا کلام ملک و قوم کے لئے ایک پیغام ہے

بیہات نہ ہو تو کچھ بات نہیں۔ ان سے پہلے کتنے فارسی و اُردو شاعروں نے خدا اور انبیاء و اولیاء کو کیا کیا کہا ہے۔ غالب و مومن، امیر و داغ وغیرہ سب اس حمام میں برہنہ ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی نے پیغامبر ہونے کا دعوے نہیں کیا۔ صرف شاعری کی ہے۔ رسمی شاعری۔ جس میں طریقت و معرفت، اخلاق و موعظت کے ساتھ ساتھ رندی و بیباکی بمدینی و عیاشی کے مضامین بھی تھے۔ وہ لوگ شعر کو "برائے گفتن" سمجھتے تھے اس لئے ناگفتنی بھی کہہ جاتے تھے۔ نہ پرہیزگاری کا دعویٰ تھا، نہ رندی کا اعلان۔ اسی لئے ان کے "کلمات کفر" پر بھی اعتراض نہیں کیا۔

سیماب صاحب کبھی بیباکی رشاعرانہ مصلح اعظم بننے کا دعویٰ چھوڑ دیں سب اعتراضات اُٹھے جاتے ہیں۔ پھر بقول خواجہ عطار کے، "ہر چہ خواہی بگو و یاک مدار"

"الحق"

(نگار) حضرت سیماب کی نظم "موحد اعظم" کچھ عرصہ سے مولویوں اور شاعروں میں موضوع گفتگو بنی ہوئی ہے۔ اس دوران میں متعدد مقالے اور استفسارات ہمیں بھی موصول ہوئے۔ چند استفسارات کا جواب تردیدوں کے ذریعہ سے دیدیا گیا۔ لیکن مقالوں کی اشاعت غیر ضروری سمجھی گئی۔ لیکن چونکہ اس مقالہ کے آخری حصہ میں ایک اصولی بحث آگئی ہے۔ اس لئے اس کی اشاعت کو ضروری سمجھتے ہیں۔

مقالہ نگار نے جو اعتراضات شاعر کے متعلق کئے ہیں، اس کا جواب دینا سیماب صاحب کے ذمہ ہے، لیکن مذہب کو سامنے رکھ کر جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا جواب دینا ہر اُس شخص کا فرض ہے جو مذہب کو مجموعہ "مزخرفات" نہیں سمجھتا۔

سیماب صاحب نے اس نظم میں اس وقت کے رجحان مذہب پر طنزیہ تبصرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ بحالات موجودہ جبکہ ہر مولوی ایک بُت بنا ہوا ہے، شرک نے ایسی خطرناک عمومی حیثیت اختیار کرلی ہے کہ سوائے "شیطان" کے اب کوئی صحیح معنے میں "موحد" نظر نہیں آتا۔

یہ درست ہے کہ نظم کے لب و لہجہ میں تلخی زیادہ ہے، لیکن اس کے مطالعہ کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال دل میں پیدا نہیں ہوتا کہ شاعر نے شیطان کی شان میں مدحیہ قصیدہ لکھا ہے، بلکہ ایک تقابلی نفسیاتی مطالعہ معلوم ہوتا ہے، جس میں عہد حاضر کے حامیان مذہب کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

اس وقت تک مولویوں کا فتویٰ کفر و الحاد صرف شعر نگاروں تک محدود تھا، لیکن اب شعراء بھی اس میں شامل ہوتے جاتے ہیں، سچ ہے۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!

نگار کے پچھلے پرچے

(۲۶ء) - جنوری عہ ر - (۲۷ء) - اگست عہ ر - (۳۰ء) مئی عہ ر - (۳۱ء) جولائی ۸ ر - اگست ۸ ر - ستمبر عہ ر - اکتوبر ۸ ر - نومبر ۸ ر - دسمبر ۸ ر - (۳۲ء) - جنوری عہ ر - فروری عہ ر - مارچ عہ ر - مئی، جون، جولائی، ستمبر ۸ ر فی پرچہ - نومبر عہ ر - (۳۳ء) - فروری عہ ر - (۳۴ء) - فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر عہ ر فی پرچہ - (۳۶ء) دسمبر عہ ر - (۳۶ء) جنوری عہ ر - (۳۷ء) - جنوری عہ ر - فروری عہ ر - مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست ۸ ر فی پرچہ - اکتوبر عہ ر - (۳۸ء) جنوری عہ ر، فروری ۸ ر، اپریل عہ ر، مئی تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ - (۳۹ء) - جنوری عہ ر، فروری تا جولائی ۸ ر فی پرچہ - ستمبر عہ ر - اکتوبر، نومبر ۸ ر فی پرچہ - (۴۰ء) - جنوری عہ ر، فروری تا جون ۸ ر فی پرچہ، جولائی و اگست عہ ر فی پرچہ، ستمبر تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ (۴۱ء) - جنوری، فروری عہ ر - مارچ تا دسمبر ۶ ر فی پرچہ - (۴۲ء) جنوری فروری عہ ر - مارچ، اپریل، مئی ۸ ر فی پرچہ -

منیجر نگار

پورب اور پچھم ——— دو ہواؤں کا تصادم

یعنی

چین کے معاشرتی انقلاب کا نفسیاتی مطالعہ

(بہ سلسلۂ ماسبق)

جب میں نے اپنے گھر کو خیرباد کہا اور اُس سُرخ کرسی پر بیٹھی، جس پر بیٹھ کر دلہن شوہر کے گھر جاتی ہے تو مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ میں اپنے شوہر کو خوش نہ کر سکوں گی۔ مجھے اس خیال سے اُس وقت مسرت تھی کہ میرا جسم ہلکا پھلکا اور خوبصورت رہے اور میرے چہرے کی ساخت بیضاوی ہے جس کو دیکھ کر سب خوش ہوتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ میرا شوہر بھی میری شکل دیکھ کر خوش ہوگا۔

شراب کی رسم کے موقعہ پر میں نے اپنی نقاب کے ریشمی تاروں سے اُس کو دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ وہ سخت قسم کے سیاہ بدیشی کپڑوں میں ملبوس تھا۔ اُس کا جسم لانبا اور بانس کی طرح سیدھا تھا۔ میرا دل یہ یک وقت سرد بھی ہوا اور اُچھلنے بھی لگا۔ میں تو دل ہی دل میں اُس کو دیکھنے کے لئے مر رہی تھی مگر اُس نے میری طرف نظریں بھی نہیں اُٹھائیں ہم نے ایک ساتھ شراب پی اور ایک ساتھ اُس کی خاندانی لوح کے سامنے سر جھکایا اور پھر میں نے اُس کے پاک اجداد کے سامنے بھی سر خم کیا۔ لیکن اُس نے مجھے قطعاً نہیں دیکھا۔

اُسی رات دعوت اور فلک شگاف قہقہوں کے بعد میں حجلۂ عروسی میں تنہا بیٹھی تھی اور خوف سے دبی جا رہی تھی۔ زندگی کا وہ لمحہ جس کے متعلق میں سوچا کرتی تھی، جس کا مجھے ڈر بھی تھا اور جس کی آرزو بھی، بالآخر آ ہی گیا۔ اُس نے آہستہ سے نقاب سرکائی اور غور سے میری صورت دیکھی، وہ دیر تک دیکھتا رہا، گویا اُس نے میری شکل پسند کی۔ پھر میرے سرد ہاتھ اُس نے اپنے ہاتھوں میں لئے۔ میری ماں نے مجھے تعلیم دی تھی کہ :- "گرم جوشی سے سرد مہری بہتر ہوتی ہے اور شراب کا بد ذائقہ پن شہید کی اُس شیرینی سے اچھا ہوتا ہے، جس سے طبیعت فوراً سیر ہو جائے۔ اگر تم نے اس کو یاد رکھا تو تمہارے شوہر کی طبیعت تم سے کبھی بھی سیر نہ ہوگی"۔

یہی وجہ تھی کہ میں نے اُس کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دیتے ہوئے کچھ ہچکچاہٹ محسوس کی، میرے شوہر نے بھی شاید اس کو محسوس کر لیا چنانچہ اُس نے خاموشی کے ساتھ اپنے ہاتھ الگ کر لئے۔ پھر اُس نے پر خلوص سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا اُس کی آواز بیحد دلکش تھی، گہری مردانہ آواز۔ میرا بدن مارے شرم کے کانپنے لگا۔ پہلے تو میں اُسکی باتیں سمجھ ہی نہیں پائی، پھر کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگیں۔ وہ کیا کہہ رہا تھا؟

"آج پہلی بار ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا ہے۔ یہ ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ تمہیں ہم سے محبت ہو ہی جائے گی۔ یہ شادی ہم دونوں پر زبردستی عاید کی گئی ہے ہم لوگ اب تک اِس معاملہ میں قطعاً بے بس تھے۔ لیکن اب جبکہ ہم دونوں تنہا ہیں اپنی زندگی اپنی خواہش کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نئے طریقوں کو پسند کرتا ہوں۔ ہر معاملہ میں تم کو میں اپنے برابر سمجھوں گا اور کسی بات کے لئے مجبور نہ کروں گا۔ تم میری ملکیت یا منقولہ جائداد نہیں ہو۔ ہاں اگر چاہو تو میری دوست بن سکتی ہو"۔

بہن! یہ تھیں وہ باتیں جو مجھے اپنی شادی کی پہلی رات میں سننی پڑیں۔ پہلے تو میں اُس کا مطلب ہی نہیں سمجھی اور پھر جب میں نے سمجھا تو مجھے بڑی حیرانی ہوئی — میں اُس کے برابر ہوں؟ لیکن یہ کیونکر ممکن ہے؟ کیا میں اُس کی بیوی نہیں ہوں؟ اگر وہ میری رہبری نہ کرے گا تو کیا کوئی باہر سے مجھے راستہ بتانے آئیگا؟ کیا قانوناً وہ میرا مالک نہیں ہے؟ مجھے کسی نے اُس کے ساتھ شادی کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا۔ اور میں کرتی کیا اگر اُس کے ساتھ شادی نہ کرتی؟ شادی کرنے کی میرے پاس اور کونسی صورت تھی سوا اس کے کہ میرے والدین جو رشتہ پسند کریں میں اُسے قبول کر لوں؟ جس کے ساتھ میں بچپن سے منسوب ہو چکی تھی، اُس کے علاوہ اور کس سے میں شادی کرتی؟ یہ سب تو بالکل دستور کے مطابق ہوا تھا۔ اس میں زبردستی کا کیا سوال ہے۔

اُس کے الفاظ میرے کان میں گونج رہے تھے کہ "یہ شادی ہم دونوں پر زبردستی عاید کی گئی ہے"، میں ڈر کے مارے بیہوش سی ہوئی جا رہی تھی۔ کیا وہ

میرے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا؟

بہن ! میں سخت کرب و بیچینی میں مبتلا تھی، اور دونوں ہاتھ گود میں رکھے مل رہی تھی۔ اول تو بولنے کی میرے اندر ہمت نہیں تھی ۔ ۔ ۔

میں نے صبح کے وقت خادمہ کو گرم پانی لانے کا حکم دیا۔ وہ پانی پیتل کے تسلے میں لیکر ایک خادمہ کے ہمراہ اپنی ساس کے کمرہ کی طرف چلی۔ میں نے سر خم کر کے لجاجت کے ساتھ کہا کہ:

"میں التجا کرتی ہوں کہ اس پانی سے ہاتھ منھ دھو کر آپ میری عزت افزائی فرمائیں"

وہ اپنے بستر پر ساٹن کی ریشمی رضائی اوڑھے پہاڑی دھج کی طرح لیٹی تھی۔ وہ اُٹھی تو اُس کے چہرہ پر نظر ڈالنے کی میں جرأت نہ کر سکی۔ اُس نے فارغ ہونے کے بعد تسلا ہٹانے اور رخصت ہونیکا اشارہ کیا۔ تسلا ہٹاتے ہوئے میرے ہاتھ نہ جانے ریشمی پردوں میں اُلجھے یا ڈر کے مارے اُن میں لرزش پیدا ہوگئی، بہرحال ایک ذرا سا پانی بستر پر گر پڑا۔ ڈر کے مارے میرے جسم میں خون کی گردش رک گئی میری ساس نے اپنی بھاری آواز میں ڈانٹ کر کہا:۔ "بہو کو یوں ہی کام کرنا چاہئے؟"

میں جانتی تھی کہ ایسے موقعہ پر اپنی صفائی میں بولنا بدتہذیبی ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے، لیکن تسلا سنبھالتے ہوئے میں باہر آگئی۔ اُس وقت میرا شوہر بھی اُدھر سے گزر رہا تھا اور میں نے محسوس کیا کہ اُس کا چہرہ مارے غصہ کے سُرخ تھا۔ میں ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ مجھ ہی پر خفا نہ ہو کہ پہلے ہی موقعہ پر اُس کی ماں کو میں خوش نہ کر سکی۔ میں نے اپنے آنسو خشک کرنے کی بھی ہمت نہ کی اگرچہ میں محسوس کر رہی تھی کہ وہ ڈھلک کر گالوں تک آچکے تھے۔ میں نے آہستہ سے کہا:۔ "یہ تسلا پھسلتا ہے اور ——"

"میں تم کو الزام نہیں دیتا" اُس نے میری بات کاٹ کر کہا "میں اپنی بیوی سے نوکروں کا کام نہ لوں گا۔ میری ماں کے پاس سیکڑوں نوکر ہیں"

میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں اُس کی ماں کی تابعداری کروں گی۔ میری ماں نے مجھے وہ سب کچھ سکھلایا ہے، جس کی ایک بہو کو ضرورت ہوتی ہے۔ میں بڑی خاکساری کے ساتھ اُس کے سامنے آئوں گی اور اُس کی موجودگی میں برابر سر جھکائے کھڑی رہوں گی۔ اُسے صدر میں لے جا کر بٹھاؤں گی۔ اُس کی پیالی میں گرم گرم چائے ڈال کر دونوں ہاتھوں سے اُس کے سامنے پیش کروں گی۔ لیکن میرا شوہر تو ارادہ کر چکا تھا۔ اُس نے میری ایک بھی نہ سنی —— یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ معاملہ آسانی سے طے ہوگیا۔ اُس کے والدین کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے۔ اُنکی خواہش تھی کہ ہم لوگ رواج کے مطابق آبائی مکان ہی کی چھت کے نیچے زندگی بسر کریں۔ اُس کا باپ پڑھا لکھا آدمی ہے اور اُس کی کمر علم کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہے۔ اپنے کمرہ میں وہ آبائی لوح کے نیچے بیٹھا تھا، اُس نے اپنی مختصر سی داڑھی پر بار بار ہاتھ پھیر کر کہا:۔ "بیٹا، تم یہیں رہو۔ میرا جو کچھ ہے وہ آخر تمہارا ہی تو ہے۔ جب تمہارے گھر میں کھانے پینے کی کمی نہیں ہے تو پھر محنت کرنے سے کیا حاصل۔ تم آرام کے ساتھ زندگی گزارو اور کتابیں پڑھا کرو جس کا تم کو شوق ہے۔ یہیں تمہارے بال بچے ہوں جس سے ہمارا گھر آباد ہو۔ ایک چھت کے نیچے تین پشتوں کو رہتے دیکھکر دیوتا بھی خوش ہوتے ہیں"

میرا شوہر بڑا ہی جلد باز ہے۔ اُس نے باپ کے سامنے سر جھکائے بغیر جواب دیا کہ:۔ "محترم باپ! میں محنت کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی ہے جس کو مغرب میں سب سے زیادہ شریفانہ پیشہ سمجھا جاتا ہے۔ رہا یہ اولاد پیدا کرنا، میں اس کو پہلا درجہ نہیں دیتا۔ میں تو اپنے دیش کی بھلائی کے لئے پہلے اپنے دماغ کا پھل پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ جسمانی پھل تو کتے بھی پیدا کر لیا کرتے ہیں"

میں دروازے کے پاس پردوں سے لگی یہ باتیں سُن رہی تھی۔ میرا جسم خوف کے مارے کانپ رہا تھا۔ اگر وہ اپنے باپ کی پہلی اولاد ہوتا یا اُسے پُرانے زمانہ کی تعلیم دیجاتی تو وہ ایسی باتیں نہ کرتا۔ یا اگر برسوں اُن ملکوں میں اُس نے زندگی نہ گزاری ہوتی جہاں چھوٹے بڑوں کی عزت نہیں کرتے تو وہ اپنے باپ کو اس نالائقی کے ساتھ جواب نہ دیتا۔ لیکن رخصت ہوتے وقت اُسنے کافی سعادتمندی کا ثبوت دیا اور اپنے والدین کو یقین دلایا کہ اُس کے پہلو میں لائق اولاد کا دل ہے۔ لیکن وہ الگ ہو ہی گیا

یہ نیا مکان عجب طرح کا ہے۔ ایسا مکان میں نے تو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک چھوٹا سا چوکور کمرہ ہے اور اُسی کمرہ سے اور کمروں میں جانے کے دروازے بھی ہیں اور اوپر جانیکا زینہ بھی۔ پہلی مرتبہ جب میں اُس زینہ پر چڑھی تو بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب گری اور تب گری۔ میرے پاؤں اوپر چڑھنے کے عادی نہیں ہیں اس لئے میں تو زینہ پر بیٹھ گئی اور لکڑی کی ریلنگ پکڑے پکڑے اوپر چڑھی۔ لکڑی کا رنگ میرے کوٹ میں بھی لگ گیا۔ کوٹ میں نے فوراً بدلا کہ میرا شوہر اُس کو دیکھ کر میرا مضحکہ نہ اُڑائے۔ وہ بہت زور سے اور تیزی کے ساتھ ہنستا ہے میں تو اُسکے قہقہے سے ڈرتی ہوں

ایسے گھر میں فرنیچر لگانے کا مسئلہ آسان نہ تھا۔ میں نے ایسا گھر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کمروں سے کوئی کام لیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ میں جہیز کا کچھ سامان ساتھ لائی تھی، ایک میز، ایک بڑی کرسی اور ایک چوڑی سی مسہری جو اُس مسہری کے برابر تھی جو میری ماں کو جہیز میں ملی تھی۔ یہ میز اور کرسی تو میرے شوہر نے اُس کمرہ میں لگائی جسے وہ "کھانے کا کمرہ" کہتا ہے۔ اور بڑی مسہری جس کے متعلق مجھے خیال تھا کہ اس پر میرا لڑکا جنمے گا، وہ اوپر کے کسی کمرہ میں نہیں آئی میں نوکروں کی طرح بانس کے پلنگ پر سوتی ہوں اور میرا شوہر لوہے کے پلنگ پر لیٹتا ہے، جو ایک بنچ سے زیادہ چوڑا نہیں ہے۔ میں اتنی تبدیلی کی عادی نہیں ہو سکتی۔

مکان کا بڑا کمرہ جسے وہ "بیٹھک" کہتا ہے، وہاں اُس نے خرید کر کچھ نئی کرسیاں ڈالی ہیں۔ یہ عجیب سی ہیں اور بدشکل ہیں۔ اُن میں کوئی کرسی بھی

ایک دوسرے سے مشابہ نہیں، اور بعض کرسیاں تو بالکل معمولی بید کی بنی ہیں۔ بیچ میں ایک چھوٹی سی میز رکھی ہے جس پر ایک ریشمی کپڑا پڑا ہے اور چند کتابیں رکھی ہیں۔ کتنا بُرا معلوم ہوتا ہے — دیواروں پر اُس نے چند چوکور تصویریں لٹکائی ہیں۔ یہ اُس کے اُستادوں کی تصویریں ہیں۔ جا بجا اُس نے کچھ کپڑے بھی ٹانگے ہیں جن پر بدیشی حرفوں میں کچھ لکھا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا یہ اُس کی سند ہے۔ اس پر وہ بڑی زور سے ہنسا اور پھر مجھکو اپنی سند لاکر دکھلائی۔ جھلّی ایسے کاغذ پر کالے کالے حرفوں میں کچھ لکھا تھا۔ اُسنے اُنگلی رکھ کر اپنا نام مجھے دکھلایا جو ٹیڑھے میڑھے حروف میں لکھا تھا۔ سب سے اوپر کالج کا نام لکھا تھا، جہاں اُس نے تعلیم پائی تھی۔ سب سے نیچے اُس فن کا نام لکھا تھا جس کا اُس نے امتحان پاس کیا ہے۔ میں نے سوال کیا کہ "یہ سند کیا ہماری پرانی طبی سند 'ہان لن' کے برابر ہے؟" میرے سوال پر بھی وہ بہت ہنسا اور بتلایا کہ دونوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ یہ سند ایک بڑے چوکھٹے میں مہمانوں کے بیٹھنے والے کمرے میں عین اُس جگہ ٹنگی ہے جہاں میری ماں نے اپنے مہمانوں والے کمرے میں پہلے منگ بادشاہ کی تصویر لٹکائی ہے — مغربی انداز کے اِس خوفناک مکان کو میں شاید ہی کبھی "اپنا گھر" سمجھ سکوں بڑی بڑی کھڑکیاں ہیں جن میں چاول کے کاغذ کی جگہ پر بڑے بڑے شیشے لگے ہیں جن سے آر پار دکھلائی دیتا ہے۔ تیز دھوپ سفید دیواروں کو چمکا دیتی ہے اور ذرا سی گرد بھی اگر فرنیچر پر پڑ جائے تو وہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ میں ایسی بے پناہ روشنی کی بالکل عادی نہیں ہوں۔ اگر میں لبوں پر سرخی یا بھوں پر چاول کا پاؤڈر ملتی ہوں، جس کی مجھ کو تعلیم دی گئی ہے تو یہ تیز روشنی اس درجہ اس کو نمایاں کر دیتی ہے کہ میرا شوہر کہہ اُٹھتا ہے کہ:۔ "خدا کے لئے تم یہ سب نہ کیا کرو، مجھے تو قدرتی عورت پسند ہے۔"

مگر سرخی یا پاؤڈر استعمال نہ کرنا تو حُسن کو نامکمل چھوڑ دینے کے مصداق ہے اور یہ تو ایسے ہے کہ میں بالوں میں برش تو کروں لیکن تیل نہ لگاؤں یا جوتے تو پہنوں مگر وہ بالکل سادے اور بے کڑھے ہوں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ چینی گھروں میں کھڑکیاں جھلملی دار ہوتی ہیں اس لئے چینی عورتوں کے چہروں پر روشنی ہلکی پڑتی ہے میں اس مکان میں کیونکر اُسے خوبصورت معلوم ہو سکتی ہوں۔

یہ کھڑکیاں بھی عجیب احمقانہ انداز کی ہیں۔ میرے شوہر نے سفید کپڑا خرید کر کچھ پردے مجھ سے سلوائے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ کون طریقہ ہے کہ پہلے تو دیوار میں بڑا سا سوراخ کر کے شیشہ جڑا گیا اب اُس شیشے پر پردے ڈالے جائیں گے — مکان کا فرش لکڑی کا بنا ہے۔ میرا شوہر جب اپنے ولایتی جوتے پہن کر اُس پر چلتا ہے تو بہت آواز پیدا ہوتی ہے۔ اب اُس نے ایک چوکھنٹی سی اونی پھولدار چیز فرش پر ڈالدی۔ اس پر بھی مجھکو بڑا تعجب ہوا کہ ایسی خوبصورت اور قیمتی چیز جوتوں سے روندی جائے۔ مجھ کو ڈر تھا کہ نوکر تھوک کر اُس کو خراب نہ کر دیں۔ جب میں نے یہ بات اپنے شوہر سے کہی تو وہ بیحد خفا ہوا اور کہا کہ فرش تھوکنے کے لئے نہیں ہوتا۔

"فرش پر نہیں، تو پھر آدمی کہاں تھوکنے جائے؟"

"گھر کے باہر" اُس نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

نوکروں کے لئے یہ بیحد مشکل تھا۔ اور نوکر تو نوکر تھے خود میں اکثر بھول جاتی اور تربوز کے بیج فرش پر ڈال دیتی۔ اب اُس نے اگالدان خرید کر ہر کمرے میں رکھدئے ہیں اور صرف اُس میں تھوکنے کی ہدایت کی ہے۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ جس کپڑے سے منہ پونچھتا ہے، اُس کو پھر جیب میں ڈال لیتا ہے۔ یہ بھی کتنی گندی مغربی عادت ہے۔

آہ! بعض وقت تو جی چاہتا ہے کہ اس گھر کو چھوڑ کر کہیں بھاگ جاؤں لیکن جاؤں بھی تو کہاں جاؤں۔ ان حالات میں ماں کو تو میں صورت دکھلانے سے رہی اور دوسری کوئی جگہ نہیں ہے جہاں مجھے پناہ مل سکے۔ بہرحال زندگی کے دن، مہینے دن اور تنہائی کے دن کسی نہ کسی طرح کٹ ہی رہے ہیں۔ صبح سے شام تک وہ کام کرتا ہے، بالکل مزدور کی طرح جسے اپنا پیٹ پالنے کے لئے محنت ضرور کرنی پڑتی ہے۔ گویا وہ ایک معزز امیر کبیر افسر کی نہیں بلکہ کسی غریب مزدور کی اولاد ہے۔ صبح کو آفتاب کے بلند ہونے سے پہلے وہ باہر نکل جاتا ہے اور پھر میں شام تک اس مکان میں اکیلی پڑی رہتی ہوں۔ مکان کے اندر سب نئے نوکر ہیں، اُن کی باتیں سُن سُن کر میں شرمایا کرتی ہوں۔ اکثر میں تو سوچتی ہوں کہ زنانہ مکان کی چار دیواری میں بند رہنا اور ساس کے ساتھ میں زندگی گزارنا اِس زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔ وہاں کم از کم قہقہے کی آوازیں تو سنائی دیا کریں گی۔ یہاں تو مکان کی دیواروں پر ہر وقت خاموشی بادل کی طرح چھائی رہتی ہے۔ میں دن بھر بیٹھی یہ سوچا کرتی ہوں کہ اُس کے دل پر کیسے قابو حاصل کروں — روزانہ صبح اُٹھتی ہوں اور پھر اُس کے سامنے جانے کے لئے بناؤ سنگار کرتی ہوں۔ چاہے رات بھر مارے بیچینی کے نیند نہ آئی ہو مگر سویرے اُٹھ کر گرم پانی سے ہاتھ منہ دھونا تیل وغیرہ استعمال کرنا ضروری ہے تاکہ اُسکا دل لبھا سکوں۔ میں جس قدر بھی سویرے اُٹھوں وہ مجھ سے پہلے ہی اُٹھ چکا ہوتا ہے۔ میں روزانہ اُس کو میز پر پڑھتے پاتی ہوں۔ ہر روز یہی ہوتا ہے، آہستہ سے کھانس کر دروازے کا ہینڈل گھماتی ہوں۔ یہ بھی کتنے عجیب و غریب ہینڈل ہیں۔ اُن کو کھولنے کے لئے مجھے کتنی بار مشق کرنا پڑی ہے۔ اب بھی روزانہ میں اُس کی غیر موجودگی میں اسکی مشق کرتی ہوں تاکہ اُس کے سامنے جلدی سے کھول سکوں۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی صبح کے وقت میرا ہاتھ پھسل ہی جاتا ہے اور میں جلدی کھول نہیں پاتی ہوں۔ میرا دل بیٹھنے

لگتا ہے کیونکہ اُس کو آہستگی سے نفرت ہے۔ چلتے وقت وہ بڑی پھرتی کے ساتھ اپنے جسم کو جنبش دیتا ہے۔ میں تو ڈرتی ہوں کہ کسی وقت وہ اپنے جسم کو مجروح نہ کرلے۔

اُس کو اپنے جسم کے تحفظ کی بھی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ روزانہ صبح کو جاڑے میں جب گرم چائے اُس کے سامنے میں پیش کرتی ہوں تو وہ اُس کو قبول کرنے کے لئے بھی اپنی نظریں کتاب سے نہیں ہٹاتا۔ میں ہر روز صبح نوکر کو بیکار جوہی کے پھول لانے کے لئے بھیجتی ہوں۔ اُن کی خوشبو تو ولایتی کتابوں کے اندر نہیں گھس سکتی۔ بارہ دنوں میں گیارہ دن یہ ہوتا ہے کہ جب میں اُس کی غیر موجودگی میں کمرے کے اندر یہ دیکھنے جاتی ہوں کہ اُس نے چائے پی یا نہیں تو میں دیکھتی ہوں اُس نے تو پیالی کا ڈھکن بھی نہیں کھولا ہے اور چائے کی پتیاں برابر تیر رہی ہیں۔ اُس کو کتابوں کے سوا اور کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں۔

میری ماں نے شوہر کو خوش کرنے کے جتنے جتن بتلائے تھے میں نے سب کو آزما دیکھا۔ میں نے لذیذ کھانے پکائے۔ نوکر کو بھیج کر مرغ کا تازہ گوشت منگایا، بانگجو سے بانس کی تازہ پھلیاں منگوائیں، سرخ مچھلیاں، ادرک، سرخ شکر اور سویابین کی چٹنی منگوائی۔ میں نے سب کھانے بڑی محنت سے طیار کئے ان کو خوش ذائقہ اور خوشبودار بنایا جب سب چیزیں طیار ہوگئیں تو میں نے نوکر کو ہدایت کی روزانہ جو کھانا ہوا کرتا ہے، جب وہ کھایا جا چکا تب یہ کھانے لانا تاکہ میرا شوہر خوش ہوکر کہہ اُٹھے کہ:- "اچھے اچھے کھانے بعد کے لئے رکھ چھوڑے تھے۔ یہ تو شاہی کھانے ہیں"۔ لیکن جب یہ کھانے لگائے گئے تو اُس نے ان کو ایسی خاموشی کے ساتھ کھایا کہ گویا یہ تو روزانہ ہوا کرتے ہیں۔ اُس کے منہ سے ایک بات بھی نہ نکلی۔ میں بڑے شوق سے اُس کا چہرہ دیکھ رہی تھی، مگر وہ تو بالکل خاموش تھا۔ بانس کی پھلیاں تو اُس نے اِس طرح کھائیں جیسے وہ گوبھی ہے جو کسی کھیت سے منگالی گئی ہے۔ رات کو جب میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو میں نے سوچا کہ شاید یہ کھانے اُسے پسند نہیں ہیں، اسی وجہ سے وہ خاموش رہا۔ اور چونکہ وہ خود کبھی کسی کھانے کی فرمائش نہیں کرتا ہے اس لئے میں کسی نوکر کو اُس کی ماں کے پاس یہ دریافت کرنے کے لئے بھیجوں کہ اُس کو کونسے کھانے پسند ہیں۔ میں نے یہی کیا۔ اس کی ماں نے جواب دیا کہ "سمندر پار جانے سے پہلے تو اُسے بطخ کا بھنا ہوا گوشت جو جنگلی بیر کے سرکہ میں تر کیا گیا ہو پسند تھا۔ لیکن برسوں تک مغربی باشندوں کے وحشیانہ اور کچے پکے کھانے کھانے کے بعد، اُس کو اچھے کھانوں کی کوئی خواہش نہیں رہی"۔

میں یہ سُنکر خاموش ہوگئی۔ میرے شوہر نے مجھ سے ابتک کسی چیز کی فرمائش نہیں کی شاید اُس کو کوئی ایسی ضرورت ہی پیش نہیں آئی جس کو میں پورا کرسکوں۔

اِس گھر میں آنے کے کوئی پندرہ دن بعد، ہم لوگ شام کو کمرہ میں بیٹھے تھے۔ میں جس وقت وہاں پہونچی تو میرا شوہر ایک موٹی سی کتاب پڑھ رہا تھا۔ سامنے والے صفحہ پر ایک تصویر تھی جس پر میری نظر پڑی۔ یہ ایک آدمی کی تصویر تھی جو سیدھا کھڑا تھا۔ لیکن میں یہ تصویر دیکھ کر ڈر گئی کیونکہ یہ صرف ڈھانچہ ہی ڈھانچہ تھا اور گوشت کا کہیں نام ونشان بھی نہ تھا۔ مجھے بڑی تکلیف ہوئی کہ وہ اِس قسم کی کتابیں کیوں پڑھتا ہے۔ لیکن میری زبان سے ایک حرف بھی نہ نکل سکا۔

میں بید کی عجیب سی کرسی پر جو وہیں پڑی تھی بیٹھ گئی۔ میں سیدھی بیٹھی رہی اور پیچھے کی طرف ٹیک نہیں لگائی کیونکہ کھلی جگہ پر اس طرح بیٹھنا نازیبا سمجھا جاتا ہے مجھے رہ رہ کر اپنی ماں کا گھر یاد آرہا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ اس وقت لوگ رات کا کھانا کھانے کے لئے جمع ہو رہے ہوں گے — میرے باپ کی داشتہ عورتیں اور اُنکے شور مچانے والے بچے، سب موم بتی کی ہلکی روشنی میں جمع ہوں گے۔ میری ماں اپنی جگہ پر میز کے کنارے بیٹھی نوکروں کو گرم گرم ترکاریاں اور چاول لانے اور سب کے سامنے تیلیاں رکھنے کا حکم دے رہی ہوگی۔ کھانے کے بعد میرا باپ اندر آئے گا اور اپنی داشتہ عورتوں کے بچوں کے ساتھ کچھ دیر کھیلے گا۔ کام ختم کرنے کے بعد سب نوکر صحن میں اپنے اپنے اسٹول پر رات کو بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ میری ماں اُسوقت میز پر بیٹھ کر باورچی سے دن بھر کے خرچ کا حساب لیگی اور اُسوقت سرخ بتی کی روشنی اُس پر پڑے گی۔

میں وہاں جانے کے لئے بے قرار تھی ——— میں اس وقت وہاں پھولوں کی کیاری پر ٹہل کر غور کیا کرتی تھی کہ نئے پودے نکلنے شروع ہوئے یا نہیں کیونکہ بہار شروع ہوچکی تھی اور یہی زمانہ اُن کے نکلنے کا تھا۔ چاند کے کچھ بلند ہونے کے بعد میری ماں مجھے ستار لانے کے لئے کہتی اور پھر وہ اپنے پسندیدہ نغمے الاپنا شروع کرتی۔

اِس خیال کے ساتھ ہی میں اپنا ستار لانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ ستار کو اُس کے خانہ سے نکالا، جس کے اندر موسیقی کی آٹھ روحوں کی تصویریں سیپی پر کھدی ہوئی ہیں۔ خود ستار میں تاروں کے نیچے طرح طرح کی لکڑیاں لگی ہیں۔ جب تاروں سے سر چھوٹتے ہیں تو اُس وقت اُن سروں میں یہ لکڑیاں اپنے حسین نغموں کا بھی اضافہ کردیتی ہیں۔ یہ ستار اور اُس کا خانہ میری دادی کے لئے اُن کے باپ نے اُس وقت خریدا تھا جب پاؤں کے باندھے جانے پر انھوں نے اپنا رونا موقوف کیا تھا۔

میں نے آہستہ سے تاروں پر چوٹ لگائی اور اُس کے ساتھ ہی ایک ہلکی سی غم آگیں آواز پیدا ہوئی۔ یہ میرا خاندانی ستار ہے اور میں اس کو چاندنی رات میں خاموش

پانی کے کنارے کسی درخت کے سایہ میں بیٹھ کر بجانا چاہئے۔ اُس وقت اس کے نغمے زیادہ میٹھے اور سریلے ہوتے ہیں۔ لیکن اس نامانوس اور سنسان کمرے میں اُس کی آواز بھی کمزور نکل رہی تھی۔ پہلے میں نے کچھ ہچکچاہٹ محسوس کی لیکن پھر میں نے سنگ کے زمانہ کا ایک پرانا نغمہ شروع کیا۔ میرے شوہر نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔

"یہ تو بہت اچھا نغمہ ہے" اُس نے کہا "مجھ کو یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ تم یہ بھی جانتی ہو۔ میں تم کو کچھ دنوں میں پیانو خرید دوں گا اور تم مغربی موسیقی بھی سیکھ لینا" اور پھر اُس نے کتاب پڑھنا شروع کر دیا۔

وہ موٹی سی کتاب پڑھ رہا تھا اور میں اُس کا چہرہ دیکھ رہی تھی اور آہستہ آہستہ ستار بجا رہی تھی اگرچہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت میں کیا بجا رہی ہوں میں نے پیانو کی کبھی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ میں یہ بدیشی چیز لے کر کیا کروں گی؟ پھر یکایک میری اُنگلیاں رک جاتی ہیں، میں ستار ایک طرف رکھ دیتی ہوں اور سر ٹکا کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتی ہوں — میرا شوہر بڑی دیر کے بعد اپنی کتاب بند کر کے میری طرف متوجہ ہوتا ہے۔

"کیوی لین" اُس نے مجھے مخاطب کیا۔

میرا دل اُچھل پڑا۔ آج پہلا موقعہ تھا جبکہ اُس نے نام لے کر مجھ کو پکارا ہے۔ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتا ہے؟ میں نے شرمیلے پن کے ساتھ اپنی نظریں اُٹھائیں۔

"شادی کے بعد سے برابر میرا جی چاہتا ہے کہ میں تم سے پیر کھولڈالنے کی استدعا کروں۔ یہ تمہارے سارے جسم کے لئے بیحد مضر ہے۔ دیکھو تمہاری ہڈیاں اس طرح کی معلوم ہوتی ہیں"

اس نے پنسل اُٹھائی اور اپنی کتاب کے ورق پر پیر کی ایک ٹیڑھی میڑھی سی تصویر بنا دی جو بالکل میرے پیر کی نقل تھی۔ اُس کو میرے پیر کی شکل کیسے معلوم ہوئی؟ میں نے تو آج تک اُس کی موجودگی میں جوتے بھی نہیں پہنے تھے۔ ہم چینی عورتیں کبھی کسی کے سامنے اپنا پیر نہیں کھولتے۔ یہاں تک کہ رات کو بھی ہم لوگ موزے پہنے رہتے ہیں۔

"تم کو یہ کیسے معلوم ہوا؟" میں نے سوال کیا۔

"اس لئے کہ میں ڈاکٹر ہوں۔ اور مغرب میں میں نے یہ سیکھا ہے" اس نے جواب دیا۔ "اچھا تو میں تم سے استدعا کرتا ہوں کہ ان کو کھول ڈالو کیونکہ یہ خوبصورت بھی نہیں معلوم ہوتے اور پھر اب پیر باندھنا فیشن میں بھی تو داخل نہیں رہا۔ اس کا تم پر کچھ اثر ہوتا ہے"۔ اُس نے مسکرا کر مجھے دیکھا، اُس کی نظروں میں مہربانی تھی۔ لیکن میں نے جلدی سے اپنے پیر کرسی کے نیچے چھپا لئے۔ میں اُس کے الفاظ سنکر اچنبھے میں پڑ گئی تھی۔ کیا میرے پیر واقعتاً خوبصورت نہیں ہیں؟ مجھ کو تو ابتک ان پر بڑا ناز رہا ہے۔ میرے بچپن کے زمانہ میں میری ماں نے ہمیشہ میرے پاؤں کی خود دیکھ بھال کی اور اُن کی بندش کی مضبوطی روزانہ بڑھائی گئی۔ جب میں درد کے مارے چیخنے لگتی تو وہ کہتی کہ اسی کی بدولت ایک دن تمہارا شوہر تمہارے پیروں کے حسن کی تعریف کرے گا۔

میں نے اپنے آنسو چھپانے کے لئے اپنا منہ پھیر لیا۔ مجھ کو اس وقت وہ دن اور وہ راتیں یاد آ رہی تھیں جب مارے تکلیف کے میں تڑپا کرتی تھی، نہ کھانے کو جی چاہتا تھا اور نہ کھیلنے کو۔ میں اپنے پلنگ کے کنارے بیٹھ کر پیر کو ہلاتی تھی تاکہ اس سے خون کا بوجھ کچھ کم ہو اور ذرا سا سکون ہو جائے۔ اور اتنے دنوں تک مصیبت برداشت کرنے کے بعد جب اِدھر کچھ دنوں سے تکلیف کم ہوئی ہے تو آج معلوم ہوا کہ وہ خوبصورت نہیں ہیں۔

"نہیں، میں یہ نہیں کر سکتی" میں نے آنسو پیتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں نے یہ انکار اس لئے نہیں کیا تھا کہ مجھے اپنے پیروں کی زیادہ پرواہ تھی۔ بلکہ میں نے سوچا کہ حسین پھولدار جوتوں میں پڑے ہوئے پیر جب اُس کی محبت نہ حاصل کر سکے تو پھر اب اس کی کیا امید ہو سکتی ہے کہ وہ کبھی مجھ سے محبت کرے گا

چین کے دستور کے مطابق، دو ہفتہ کے بعد میں اپنے گھر پہلی بار روانہ ہوئی۔ میرے شوہر نے پھر پیر کھولنے کے متعلق دوبارہ کچھ نہیں کہا اور نہ پھر اُس نے مجھے نام لیکر پکارا ہی۔

تم پریشان تو نہیں ہو رہی ہو میری بہن؟ اچھا تو میں پھر شروع کرتی ہوں:—

مجھ کو رخصت ہوئے اگرچہ زیادہ دن نہیں گزرے تھے مگر مجھ کو تو محسوس ہوتا تھا کہ چاند اس عرصہ میں اپنی گردش سیکڑوں بار پوری کر چکا ہے۔ رخصت ہوتے وقت میں کچھ کم پُرامید نہ تھی اور خوفزدہ بھی تھی اور اب جبکہ ایک بیاہی عورت کی حیثیت سے میں واپس آئی ہوں، جب میری چوٹی جوڑے میں تبدیل ہو چکی ہے اور میری پیشانی اُن بالوں سے پاک ہو گئی ہے جو ناکتخدائی کی نشانی ہیں — تو اب بھی میں کم و بیش پہلے ہی جیسی لڑکی ہوں، پہلے سے زیادہ خوفزدہ، زیادہ تنہا اور کم پرامید۔

میری ماں اپنے حصہ پر جھکی ہوئی پہلے صحن تک میرے استقبال کے لئے آئی۔ مجھ کو وہ پہلے سے کچھ زیادہ پریشان نظر آئی، یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے اُس کو

آج زیادہ عرصہ کے بعد دیکھا تھا۔ بہر حال اُس کی آنکھوں کی غم انگیزی کے اضافہ نے مجھے اُس سے اور بھی قریب تر کر دیا۔ اُس کے سامنے سر خم کرنے کے بعد میں نے اُس کے ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں لے لئے اور خود اُس نے بھی آہستہ سے میرے ہاتھ دبائے۔ ہم لوگ ایک ساتھ زنانہ مکان کے صحن کی طرف بڑھ رہے تھے۔

آہ! میں بھی کس قدر حریصانہ انداز میں ہر چیز کو دیکھ رہی تھی۔ میں سمجھ رہی تھی کہ ہر چیز میں ضرور کچھ نہ کچھ تبدیلی ہو گئی ہو گی مگر نہیں ہر چیز صحن میں پہلے کی طرح اپنی جگہ پر تھی، سوا اس کے کہ جب داشتہ عورتوں، اُن کے بچوں اور نوکروں نے مجھے دیکھا تو وہ سب ہنستے، اور چلاتے ہوئے میرے گرد جمع ہو گئے۔ اوائل خزاں کا سورج پھول کی دیواروں پر چمک رہا تھا، صحن کے پتھروں کو جگمگا رہا تھا اور تمام جھاڑیوں اور تالاب پر اُس کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ کمروں کے جنوبی حصہ کے تمام دروازے اور کھڑکیاں کھول دی گئی تھیں تاکہ گرمی اور دھوپ وہاں تک پہونچ سکے چنانچہ آفتاب کی کرنیں چھت کی رنگین اور نقشی کڑیوں تک پہونچ رہی تھیں۔ اگرچہ مجھ کو اس کا پورا احساس تھا کہ اب میرے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں رہی لیکن اس کے باوجود میری روح اپنے حقیقی آشیانے میں خوش تھی۔

میں صرف ایک کمی محسوس کر رہی تھی۔

"تیسری داشتہ کہاں ہے؟" میں نے اپنی ماں سے سوال کیا

میری ماں نے ایک لونڈی کو حقہ بھرنے کے لئے آواز دیتے ہوئے کہا:- "تم نے لامے کے متعلق سوال کیا تھا؟ ہاں میں نے اُسے تبدیل آب و ہوا کی غرض سے دیہات بھیج دیا ہے۔

اُس کے انداز سے میں سمجھ گئی کہ زیادہ سوال کرنا بے سود ہے اور شام کو جب میں اپنے پرانے بچپن والے کمرے میں سونے کا انتظام کر رہی تھی تو پہلے کی طرح وانگ ڈاما میرے بالوں میں برش کرنے کے لئے کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس نے اور باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتلایا کہ میرا باپ ایک چوتھی داشتہ کا اضافہ کرنے والا ہے۔ جو پیکنگ کی ایک رقاصہ ہے اور جس نے جاپان میں تعلیم حاصل کی ہے اور میرے باپ کی تیسری داشتہ کو اس بات کا اتنا صدمہ ہوا کہ اس نے تو جان ہی دیدینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ وہ میرے کی جو انگوٹھی پہنے ہوئے تھے، اُس کا نگ وہ کھا گئی اور دو دن تک کسی کو اس کا پتہ بھی نہ چلا۔

بالآخر میری ماں کو اس کا پتہ چلا۔ اُس نے ایک ڈاکٹر کو بلوایا جس نے اُس کی کلائی اور اُس کے ٹخنوں میں سوئیاں بھوکیں لیکن اس سے بھی کوئی افاقہ نہ ہو سکا۔ ایک پڑوسی نے ولایتی اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا مگر میری ماں اس کے لئے مستعد نہ ہوئی کیونکہ ہم لوگوں کو ولایتی آدمیوں کا کچھ حال نہیں معلوم اور اس کے علاوہ کسی غیر ملکی آدمی کو یہ کیونکر پتہ چل سکتا ہے کہ چینی کو کیا مرض ہے؟ غیر ملکی ڈاکٹر اپنے لوگوں کا مرض سمجھ سکتے ہیں جو متمدن اور پر پیچ چینیوں کے مقابلہ میں وحشی اور سادہ ہوتے ہیں۔ اتفاقاً اُس وقت میرا بھائی بھی گھر پر "آٹھویں چاند" کا تہوار منانے آیا تھا، وہ خود جا کر ایک ولایتی ڈاکٹرنی کو بلا لایا۔

ڈاکٹرنی اپنے ساتھ ایک عجیب سا اوزار لائی، جس میں ایک لمبی سی نلی لگی تھی۔ اور اُس اوزار کو اُس نے مریض کے حلق میں گھسیڑ دیا اور اُسی کے ساتھ نگ باہر آگیا۔ ہر شخص سوا اُس ڈاکٹرنی کے اس بات پر بیحد متعجب تھا۔ ڈاکٹرنی نے خاموشی کے ساتھ اپنا اوزار اُٹھایا اور باہر چلی گئی، جیسے یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔

دوسری داشتہ عورتیں اُس سے بیحد خفا تھیں کہ اُس نے اتنی قیمتی چیز کیوں برباد کی۔ چنانچہ موٹی عورت نے کہا:-

"اس سے اچھا تھا کہ تم دیا سلائی کی تیلیوں کو چبا لیتیں جو ایک پیسہ میں بہت سی ملتی ہیں"

لیکن اُس نے کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اب اُس کی حالت آہستہ آہستہ روبہ اصلاح تھی لیکن اِس عرصہ میں کسی نے اُس کو کھاتے پیتے یا باتیں کرتے نہیں دیکھا۔ وہ ہر وقت پردے ڈالے ہوئے پلنگ پر پڑی رہتی۔ اُس کو اپنی ناکامی کا بڑا صدمہ تھا اور اُس کا چہرہ بالکل اُتر گیا تھا۔ میری ماں کو اُس پر بہت ترس آیا اور اُس نے اُس کو باہر بھیجدیا تاکہ لوگوں کے طنز سے وہ محفوظ رہے۔

یہ چھوٹی سی بات تھی اسی وجہ سے میری ماں نے شاید اس کا ذکر مجھ سے نہیں کیا۔ مگر چونکہ مجھے اس گھر سے بیحد اُنس ہے اس لئے میں نے سارا قصہ تفصیل کے ساتھ وانگ ڈاما سے سنا۔ یہ ہمارے گھر کی پرانی خادمہ تھی اور اُس کو ہم سب لوگوں کا حال ذرا ذرا معلوم تھا۔ وہ دراصل میری ماں کے ساتھ شان سی سے اُس کی شادی کے وقت پر آئی تھی۔ اُس نے میری ماں کے سب لڑکوں کو کھلایا ہے اور اب جب میرے بھائی کی شادی ہو گی اور اُس کے بچہ ہو گا تو اُس کو بھی یہی کھلائے گی۔

میں نے اپنی خادمہ سے جو قصے سنے اُن میں ایک بات بہت اہم تھی اور وہ یہ کہ میرے بھائی نے امریکہ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میری ماں نے اس کا بھی مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا اور وانگ ڈاما صبح کے وقت جب میرے منہ دھونے کے لئے گرم پانی لائی تو اُس نے بتلایا کہ پہلے تو میرا باپ اپنے لڑکے کے اس خیال پر بہت ہنسا کیں

پھر وہ بھی اس کے لئے بالآخر تیار ہو ہی گیا کہ وہ امریکہ پڑھنے کے لئے جائے۔ کیونکہ اب تو باہر پڑھنے جانا فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ میری ماں نے جب میرے باپ کے فیصلہ کو سُنا تو وہ بہت رنجیدہ ہوئی اور شاید اتنا صدمہ اُس کو اُسوقت بھی نہیں ہوا تھا جب میرے باپ نے پہلی داشتہ عورت کے ساتھ شادی کی تھی۔ اُس نے تین دن تک نہ تو کچھ کھایا اور نہ کسی سے بولی لیکن میرے بھائی پر جب اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا اور کسی طرح وہ اپنے ارادہ سے باز نہ آیا تو میری ماں نے کوشش کی کہ جانے سے پہلے وہ اپنی منسوبہ کے ساتھ شادی کرے۔ میری ماں نے کہا کہ: "تم شاید اس سے انکار نہ کر سکو گے کہ تمھارا گوشت و خون صرف تمھارا ہی گوشت و خون نہیں بلکہ اس پر دوسروں کو بھی حق حاصل ہے۔ اب جب کہ سب کی مرضی کے خلاف تم نے وحشی ملک میں جانے کا فیصلہ ہی کر لیا ہے تو جانے سے پہلے اپنی منسوبہ کے ساتھ شادی کر لو اور اپنے اجداد کے اُس پاک ورثہ کو جو تمھاری پشت میں محفوظ ہے دوسرے کے جسم میں منتقل کر دو تاکہ سلسلۂ نسل جاری رہے۔ اور اگر خدانخواستہ تم وہاں مر جاؤ تو میں اپنے پوتے ہی کو دیکھ کر سکون حاصل کر لیا کروں گی"۔

میرے بھائی نے جواب دیا:۔ "شادی کی مجھے کوئی خواہش نہیں ہے۔ میں تو زندگی میں زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ پیاری ماں، میں وہاں مرنہ جاؤں گا اور آپ کے پاس صحیح و سالم واپس آؤں گا۔ میں جب واپس آؤں گا تو پھر ——"

اس جواب کے بعد میری ماں نے اپنے شوہر کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ اپنے لڑکے کو کسی طرح شادی کے لئے طیار کرے، لیکن وہ بہت ہی لاپرواہ قسم کا انسان تھا، اور اُس وقت اپنی نئی داشتہ کا معاملہ طے کر رہا تھا، اُس کو ان باتوں کی کہاں فرصت تھی۔ بالآخر میرا بھائی یوں ہی کنوارا امریکہ چلا گیا۔

مجھ کو اپنی ماں کے ساتھ ہمدردی تھی۔ میرا باپ اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھا اور اس طرح سے میرا بھائی ہے۔ اگر خدانخواستہ کچھ ہو تو نسل ہی منقطع ہو جائے گی چونکہ میری ماں کے اور لڑکے بچپن ہی میں داغ دے چکے تھے اس لئے یہ میرے بھائی کا فرض تھا کہ جلد سے جلد شادی کر کے اولاد پیدا کرے تاکہ میری ماں اپنے فرض سے سبکدوش ہو کر میرے اجداد کی روح کے سامنے سرخرو ہو۔ وہ بچپن ہی سے خاندان لی کی لڑکی کے ساتھ منسوب ہو چکا ہے۔ میں نے خود لڑکی کو نہیں دیکھا ہے لیکن میں نے سنا ہے کہ وہ خوبصورت نہیں ہے۔ لیکن اُس کی بدصورتی کی میری ماں کی خواہش کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں۔

کئی دن تک مجھے اپنے بھائی کی اس نافرمانی کی بڑی تکلیف رہی۔ میری ماں نے اس کا مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا اور اس غم کو بھی اپنی روح کی گہرائی میں دفن کر لیا۔ یہ اُس کی عادت تھی کہ جب کوئی مصیبت آ ہی جاتی تو اُس کا وہ خاموشی کے ساتھ مقابلہ کرتی اور لبوں کو سی لیتی۔ چنانچہ میں بھی جانی پہچانی صورتوں اور پرانے در و دیوار کی فضا میں اپنی ماں کا غم آگیں اور پرسکوت چہرہ دیکھنے کی عادی ہو گئی۔

گھر بھر کی آنکھیں جو سوال مجھ سے کر رہی تھیں وہ وہی تھا جس سے میں ڈر رہی تھی —— میں ماں بننے والی ہوں یا نہیں؟ لوگ مجھ سے سوال کرتے اور میں خوبصورتی کے ساتھ سر کے اشارے سے ٹال جاتی۔ میں نے یہ چھپانے کی پوری کوشش کی کہ میرا شوہر میری پرواہ نہیں کرتا ہے۔ لیکن میں اپنی ماں کو دھوکا نہیں دے سکی۔

گھر جانے کے ساتویں دن میں اُس دروازے کے قریب بیٹھی تھی جو صحن کے سامنے تھا۔ شام ہو رہی تھی اور سب نوکر رات کے کھانے کے انتظام میں مشغول تھے۔ ہوا میں مچھلی اور بطخ کے گوشت کے بھوننے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور فضا گل داؤدی کی خوشبو سے معطر تھی۔ میرے اندر گھر کی اور قدیم گرد و پیش کی محبت جوش مار رہی تھی۔ میں بڑی محبت کے ساتھ ہر ایک نقش و نگار پر ہاتھ پھیر رہی تھی اور اُس جگہ آپ اپنے کو بالکل محفوظ پا رہی تھی جہاں میرا بچپن اس طرح گزرا تھا کہ اُس کے گزرنے کا مجھے احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے اس جگہ کی ہر چیز سے اُنس تھا، شام کی خاموش تاریکی سے جو آہستہ آہستہ گھر کی ترچھی چھتوں پر قبضہ جماتی، اُس مومی روشنی سے جو کمروں کو منور کرتی کھانے کی خوشبو سے، بچوں کی چلاہٹ سے اور اُن کے جوتوں کی نرم آواز سے جو زمین پر جوتوں کے پڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ آہ! میں قدیم چینی گھرانے کی بیٹی ہوں، جہاں پرانا طریقہ، پرانا فرنیچر اور پرانے مضبوط اور قدیم رشتے پائے جاتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ وہاں کس طرح زندگی گزاری جاتی ہے۔

پھر مجھے اپنا شوہر یاد آیا جو اپنے یورپی مکان میں میز کے قریب اپنے ولایتی انداز کے کپڑے پہنے اس وقت بیٹھا ہوگا۔ وہ ہر طرح سے بالکل اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ میں اُس کی اس زندگی کے ساتھ کیسے میل کھا سکتی ہوں؟ اُس کو تو میری کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میرا دل بھر آیا، میں اپنے کو بالکل تنہا محسوس کرنے لگی، میں نے کبھی بھی اپنے کو اس قدر تنہا نہیں محسوس کیا تھا۔ اب مستقبل میری آنکھوں کے سامنے تھا اور اُس میں سوا تلخی اور کچھ نہ تھا۔ میں نے تاریکی کی سمت سے اپنی آنکھیں پھیریں اور میرے گالوں پر دھیمی دھیمی روشنی پڑنے لگی۔ اتنے میں کھانے کی گھنٹی بجی اور میں اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے کھانے کے کمرے میں اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔

میری ماں آج معمول سے کچھ پہلے اپنے کمرے میں چلی گئی اور داشتہ عورتیں بھی اپنی اپنی کوٹھریوں میں داخل ہو گئیں۔ میں اکیلی بیٹھی چائے پی رہی تھی کہ وانگ ڈا نمودار

ہوئی اور کہا کہ:-

"تمھاری محترم ماں تم کو یاد کر رہی ہیں"

"لیکن انھوں نے تو کہا تھا کہ وہ سونے جا رہی ہیں" میں نے سوال کیا۔

"نہیں میں تو وہیں سے آ رہی ہوں" اُس نے جواب دیا "انھوں نے تم کو بلایا ہے"

خادمہ صحن کی طرف چلی گئی اور میں آہستہ سے پردہ سرکا کر ماں کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ خاموشی کے ساتھ بستر پر پڑی تھی ایک میز پر اُس کی بغل میں لمبی سی لیمپ بتی جل رہی تھی۔ میں نے اس طرح سے اُس کو کبھی نہیں دیکھا تھا، اس لئے مجھے کچھ تعجب بھی ہوا۔ وہ بالکل کمزور اور زرد معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور لب کچھ لٹکے ہوئے سے تھے۔ میں آہستہ سے جا کر بستر کے قریب کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرہ پر کوئی رنگ نہ تھا، بالکل سنجیدہ، نازک اور غم آگیں چہرہ۔

"ماں" میں نے آہستہ سے کہا

"بیٹی" اُس نے بھی اسی طرح جواب دیا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھے بیٹھنے کو کہہ رہی ہے یا کھڑے رہنے کو۔ پھر اُس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کا حکم دیا — میں خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئی میں نے دل میں سوچا کہ شاید وہ میرے بھائی کے خیال سے پریشان ہے جو پردیس میں پڑا ہوا ہے۔

لیکن وہ میرے بھائی کے متعلق نہیں سوچ رہی تھی۔ اُس نے اپنا چہرہ میری طرف پھیرا اور آہستہ سے کہا:-

"بیٹی! میرا خیال ہے کہ تم خوش نہیں ہو۔ جب سے تم واپس آئی ہو میں محسوس کر رہی ہوں کہ تمھاری اگلی سی آسودگی تم سے رخصت ہو چکی ہے۔ تمھاری روح مضطرب رہا کرتی ہے اور تمھاری آنکھوں میں بہت جلد آنسو آجایا کرتے ہیں۔ اگرچہ تمھارے لب خاموش ہیں مگر صاف پتہ چلتا ہے کہ کوئی غم ہے جو ہر وقت اندر ہی تمھارے دل سے ہم آغوش رہتا ہے۔ یہ قصہ کیا ہے؟ اگر تم کو اس کا دکھ ہے کہ اب تک تم حاملہ نہیں ہوئیں۔ تو صبر کرو ابھی دن ہی کتنے گزرے ہیں۔ میں نے شادی کے دو سال بعد تمھارے باپ کو بچہ کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس طرح اپنے غم کا اظہار کروں۔ ریشمی پردے کا ایک تار میرے قریب لٹک رہا تھا اور میں اُسی سے کھیل رہی تھی اور خاموش تھی۔ خیالات کا میرے دماغ میں ایک ہجوم سا تھا۔

"بولو" میری ماں نے کچھ تحکمانہ انداز سے کہا۔

میں نے اُس کی طرف نظریں اُٹھائیں۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے اور میں کچھ نہ بول سکی۔ اُن کی موجیں بڑھتی گئیں، میری سانس پھولنے لگی اور میں نے سسکیاں لینی شروع کیں۔ میں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا اور اپنا چہرہ ماں کی آغوش میں چھپا لیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے"، میں نے روتے ہوئے کہا "وہ کہتا ہے کہ تم میرے برابر ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اُس کو میرے پیروں سے نفرت ہے اور اُن کی تصویر کھینچتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اُس نے میرے پیر کیسے دیکھے جبکہ آج تک میں نے اپنا پیر کبھی بھی اُس کے سامنے کھولا نہیں ہے"

"اُس کے برابر؟" میری ماں اُٹھ بیٹھی اور سوال کیا "اس سے اُس کا کیا مطلب ہے؟ تم اپنے شوہر کے برابر کیونکر ہو سکتی ہو؟"

"مغرب میں عورتیں" میری آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔

"ہاں" میری ماں نے کہا "ہم لوگ تو یہاں کے رہنے والے ہیں۔ اور تمھارے پیر کی تصویر کیوں اُتارتا ہے؟ کیا مطلب کیا ہے؟"

"یہ بتلانے کے لئے کہ میرے پیر بدصورت ہیں" میں نے جواب دیا۔

"تمھارے پیر؟ میں نے تم کو بیس جوڑ جوتے دئے ہیں، یقیناً تم نے انتخاب میں خوش سلیقگی سے کام نہ لیا ہوگا"

"وہ میری ہڈیوں کا خاکہ اُتارتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ٹیڑھی ہیں"

"عورت کے پیر کی ہڈی آج تک کسی نے بھلا دیکھی ہے؟ کس کی آنکھیں گوشت کے اندر گھس سکتی ہیں؟"

"وہ کہتا ہے کہ میں ڈاکٹر ہوں، مجھے اندر کا حال معلوم ہے"

"میری بدنصیب بیٹی!" اُس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا "تو کیا وہ مغرب کے جادو سے بھی واقف ہے؟"

"اُس کو تو اس کی پروا نہیں ہے کہ میرے بچہ ہو۔ اُس کو مجھ سے کوئی لگاؤ بھی نہیں ہے۔ میری پیاری ماں میں تو اب تک کنواری ہوں"

پھر خاموشی چھا گئی اور میں نے اپنا چہرہ ماں کی آغوش میں چھپا لیا۔ میں نے اپنی ماں کا ہاتھ اپنے سر پر محسوس کیا جو دیر تک وہیں رکھا رہا۔ پھر وہ اُٹھ کر بیٹھی اور کہنے لگی:-

"میرا خیال ہے کہ میں نے تمہاری تربیت میں کوئی کوتاہی نہیں۔ مجھکو یقین ہے کہ کوئی شریف چینی مرد تم سے ناخوش نہیں ہو سکتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تمہاری شادی کسی وحشی کے ساتھ ہوئی ہو؟ وہ تو کنگ خاندان کا فرد ہے۔ اُس پر تو کوئی شبہ بھی نہیں کر سکتا۔ یہ اُس کے پردیس میں برسوں رہنے کا قصور ہے۔ اس خیال سے میں تمہارے بھائی کے وہاں جانے سے پہلے اُس کا مر جانا بہتر سمجھتی تھی" اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پھر لیٹ گئی۔ جب اُس نے پھر بولنا شروع کیا تو اُس کی آواز سے [illegible] ٹپک رہی تھی۔

"بیٹی! اس دنیا میں عورت کے لئے بہر حال ایک اور صرف ایک راستہ ہے جس پر وہ چل سکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اُسے اپنے شوہر کو کسی نہ کسی طرح خوش رکھنا چاہئے۔ اس کا بیحد دکھ ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ جتنی محنت کی تھی سب اکارت جا رہی ہے۔ اب میرے خاندان سے تم کو کوئی تعلق نہیں رہا اور تم اپنے شوہر کی ہو چکیں اب سوا اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ تم اپنے شوہر کو خوش کرو۔ اچھا تم ایکبار اُس کو ہاتھ میں لینے کی پھر کوشش کرو۔ گہرے سبز اور سیاہ کپڑے پہنو، عطر اور کنول کا پانی استعمال کرو۔ لبوں کی خفیف جنبش کے ساتھ مسکرایا کرو، جس میں کچھ شرم کا بھی پہلو ہو۔ تم اُس کے ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں لے کر اُن کو آہستہ سے دباؤ۔ اگر وہ ہنسے تو تم بھی خوش ہو۔ اور اگر اب بھی وہ خوش نہ ہو تو اُس کی مرضی کے آگے سر جھکا دو"

"کیا میں اپنے پیر بھی کھول ڈالوں؟" میں نے آہستہ سے سوال کیا۔ میری ماں نے کچھ دیر سوچا۔

"ہاں" اُس نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا "یقیناً کھول ڈالو، اب زمانہ بدل گیا ہے"

اچھا تم اب جاؤ

محمد عتیق صدیقی

مطبوعات طاق بستاں

خواب کی دنیا: اس موضوع پر یہ کتاب آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے اگر آپ کو بھی اس عالم سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے۔ جس میں مولانا عبدالمالک آروی نے فرائیڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید حواشی کے ساتھ اُردو میں پیش کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

الہامات شاد: شاد عظیم آبادی کے رتبۂ شاعری سے ہر شخص واقف ہے لیکن انکے کلام کا انتخاب مع ایک انتقادی و تاریخی مقدمہ کے دیکھنا چاہتے ہیں تو مولانا عبدالمالک کی اس تالیف کو ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت علاوہ محصول آٹھ آنہ

اقبال کی شاعری: یہ کتاب مولانا عبدالمالک کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اقبال پر اُردو میں اس سے بہتر نقد و تبصرہ شاید ہی کہیں اور نظر آئے اس کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ قیمت دس آنہ علاوہ محصول۔

مقام محمود: مولانا عبدالمالک کے ادبی و تاریخی مقالات کا مجموعہ۔

قیمت پانچ روپیہ (صد) علاوہ محصول

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

"نگار" کے بعض خاص نمبروں کے متعلق ضروری اعلان

نگار جنوری ۱۹۳۲ء (غالب نمبر) اب چار روپیہ فی کاپی کے حساب سے ملے گا - اور نگار جنوری ۱۹۳۵ء (اُردو شاعری نمبر) اور نگار جنوری ۱۹۳۶ء (ہندی شاعری نمبر) بالکل ختم ہو گئے ہیں۔ جن حضرات کو اشد ضرورت ہوگی، اُن کے لئے ہم دوسروں سے خرید کر فراہم کر سکیں گے لیکن قیمت کی کوئی تعیین نہیں ہو سکتی، فروخت کرنے والا جو طلب کرے گا دینا پڑے گی۔

نگار جنوری ۱۹۳۸ء (تاریخ اسلامی ہند) کی قیمت اب تین روپیہ فی کاپی اور نگار جنوری ۱۹۳۷ء (اصحاب کہف ڈراما) کی قیمت دو روپیہ فی کاپی لی جائے گی۔

سرورق کے آخری صفحہ پر جو قیمتیں نگار میں درج ہیں انھیں منسوخ سمجھا جائے۔ جن حضرات کے پاس ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۲ء تک کے جنوری نمبر نہیں ہیں وہ ابھی طلب فرمالیں، ورنہ چند دن کے بعد ان کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔

منیجر نگار

باب الاستفسار

فلکیات کے بعض مسائل

(جناب سید حمید رضا صاحب - پالن پور)

اس سے قبل نگار میں فلکیات کے متعلق بڑے اچھے اچھے مقالے شایع ہوئے ہیں، لیکن اب کچھ عرصہ سے یہ سلسلہ بند ہے۔ میری رائے میں کبھی کبھی اس قسم کے مضامین شایع ہوتے رہنا چاہئے، کیونکہ ان سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور دلچسپ تو خیر یہ موضوع اتنا ہے کہ شاید ہی کوئی دوسرا ہو، بہرحال، اس وقت میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آسمان کا رنگ نیلگوں کیوں نظر آتا ہے اور آفتاب صبح و شام یا بادل اور کہر کے اندر کیوں سرخ رنگ کا دکھائی دیتا ہے۔ کیا آپ تکلیف فرما کر اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں گے؟۔

(**نگار**) اس سے قبل نگار میں فلکیات پر اتنے مقالے شایع ہو چکے ہیں کہ اگر اُن کو یکجا کر دیا جائے تو اس موضوع پر اچھی خاصی کتاب مرتب ہو سکتی ہے، لیکن چونکہ اس فن پر تحقیقی کام برابر جاری ہے، اس لئے ہمیشہ کوئی نہ کوئی نئی بات معلوم ہوتی ہی رہتی ہے اور نگار میں بھی وقتاً فوقتاً ان کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔

مجھے یاد نہیں کہ آپ کے ان دو سوالوں کا جواب نگار کے پچھلے فایل میں کہیں ملسکتا ہے یا نہیں۔ اس لئے میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ آفتاب کا اصلی رنگ کیا ہے اور اسکی شعاعوں میں انکسار ہونے کے بعد کیا کیا رنگ نظر آتے ہیں، اسی کے ساتھ میں آپ کے دوسرے سوال پر بھی غور کروں گا۔

اگر ہم سات میل فی سکنڈ کی رفتار سے فضا میں بلند ہو سکیں تو ایک خاص مقام پر پہونچکر ہم دو باتیں محسوس کریں گے ایک یہ کہ زمین کے دائرۂ کشش سے نکلکر سورج کے دائرۂ کشش میں آگئے ہیں۔ یعنی خود بخود سورج کی طرف کھنچتے جا رہے ہیں اور دوسرے یہ کہ سورج کی روشنی کا مفہوم جو کچھ ہم نے سمجھ رکھا ہے وہ بالکل غلط ہے ہم اس رفتار سے چند سکنڈ پرواز کرنے کے بعد ہی، فضا کی روشنی میں عجیب و غریب تغیرات محسوس کرنے لگیں گے۔ یعنی وہ آسمان جو ہمیں نیلا نظر آتا ہے بلندی پر پہونچنے کے بعد تاریک دکھائی دے گا یہاں تک کہ اور زیادہ بلندی پر وہ بالکل شب دیجور نظر آئے گا اور سورج بالکل ایسا معلوم ہوگا جیسے لوہے کے توے کو سفید ہونے کی حد تک گرم کیا جائے۔ ایسا کیوں ہے، اس کی عملی توجیہ بھی سن لیجئے:-

اگر آپ نے دریا کے کنارے کسی پُل کے اندر سے پانی کے دھارے کو گزرتے ہوئے دیکھا ہے تو آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ جب کوئی بڑی لہر پُل کے پایہ سے ٹکراتی ہے تو وہ پھٹ کر آگے بڑھتی ہے اور دونوں حصے پھر ایک ہو جاتے ہیں، لیکن چھوٹی لہریں ٹکرا کر چاروں طرف منتشر ہو جاتی ہیں۔ بالکل یہی حال سورج کی روشنی کا ہے۔

وہ جب زمین کی طرف بڑھتی ہے تو فضا میں حجابات و موانع سے اس کو ویسا ہی مقابلہ کرنا پڑتا ہے، جیسا دریا کی لہر کو پُل کے پایہ کا۔ پھر یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ سورج کی روشنی بہت سے رنگوں کا مجموعہ ہے جو قوس قزح میں ہم کو الگ الگ نظر آتے ہیں، اسی کے ساتھ آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ سورج کی روشنی میں لہریں ہوتی ہیں اور لہروں کی لمبائی کے لحاظ سے رنگ پیدا ہوتے ہیں مثلاً لمبی لہروں سے سُرخ یا گہرا سنہرا رنگ ظاہر ہوتا ہے اور چھوٹی لہروں سے نیلا رنگ۔

پھر جس وقت سورج کی روشنی فضا کے حجابات و موانع سے ٹکراتی ہے تو وہ ہم تک جوں کی توں پہونچ جاتی ہے۔ اُس کی لمبی لہریں جن سے سُرخ روشنی پیدا ہوتی ہے متاثر نہیں ہوتیں، لیکن چھوٹی لہریں جن سے نیلا رنگ پیدا ہوتا ہے چاروں طرف منتشر ہو جاتی ہیں، اور اسی لئے ہمیں آسمان نیلا نظر آتا ہے۔ گویا یہ رنگ آسمان کا نہیں بلکہ روشنی کی اُن چھوٹی چھوٹی لہروں کا ہے، جو فضا میں منتشر ہو کر چاروں طرف پھیل گئی ہیں اور جب ہم سورج کو دیکھتے ہیں تو ہم اس کی سرخ لہروں سے واسطہ پڑتا ہے

جو لمبی ہوتی ہیں اور فضا میں کسی حجاب سے ٹکرا کر منتشر نہیں ہوتیں - لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ سورج کی روشنی جو کچھ ہمیں نظر آتی ہے وہ بھی اصلی روشنی نہیں ہے، کیونکہ اس میں سے نیلگوں چھوٹی لہریں علٰحدہ ہو چکی ہیں - اور اسی لئے حجابات سے ٹکرا کر چھوٹی لہریں جتنی زیادہ چھن کر علٰحدہ ہوتی جائیں گی، سورج اتنا ہی زیادہ سرخ نظر آئیگا یہی وجہ ہے کہ بادل، بھاپ اور کہر وغیرہ کے اندر سے آفتاب زیادہ سُرخ دکھائی دیتا ہے - صبح و شام، طلوع و غروب کے وقت بھی آفتاب کا رنگ زیادہ سرخ اسی لئے نظر آتا ہے کہ اُسوقت شعاعیں زیادہ فاصلہ طے کر کے ترچھی ہو کر ہم تک پہونچتی ہیں اور زیادہ حجابات سے ٹکرانے کے بعد چھوٹی لہریں (نیلگوں) بہت زیادہ چھن کر علٰحدہ ہو جاتی ہیں - سورج کی اصلی روشنی، جس وقت وہ سورج سے چلتی ہے، کئی رنگوں کا مجموعہ ہوتی ہے، لیکن جوں جوں زمین کی فضا سے قریب ہوتی جاتی ہے، اس کی چھوٹی لہریں منتشر ہوتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ ہم تک صرف سُرخ لہریں پہونچتی ہیں - اگر ایسا نہ ہو تو ہم کو سورج ویسا ہی نظر آئے جیسا کہ ایک جلتا ہوا آہنی تودا سفید ہونے کی حد تک گرم کیا گیا ہے -

مذہب و عقل

(جناب مرتضیٰ اعلی خانصاحب - اٹاوہ)

میں نے بعض لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ سچا مذہب وہی ہے جسے عقل انسانی قبول کر سکے اور جب میں آپ سے مذہبی معتقدات کے متعلق عقلی گفتگو کرتا ہوں تو بعض یہ کہتے ہیں کہ مذہب عقل سے بالا چیز ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ ہماری آپ کی عقل ہی کیا کہ غور کر کے فیصلہ کر سکیں، بتایئے اس صورت میں کیا کیا جائے -

---

(نگار) میری رائے یہ ہے کہ خاموشی اختیار کی جائے - کیونکہ ہم بس دور سے گزر رہے ہیں، اس میں اس قسم کی لایعنی گفتگو کی گنجایش ہی نہیں - اس قسم کی باتیں اگر سنجیدگی سے کی جائیں تو وہ جھگڑا پیدا کرتی ہیں اور اگر محض تفریحی مشغلہ ہو تو بے نتیجہ ہے - مذہب و عقل کی جنگ نئی چیز نہیں - جب سے انسان پیدا ہوا ہے، اسی وقت سے وہ اس مخمصہ میں پڑا ہوا ہے، پہلے بھی نظام قدرت اور حوادث طبیعی کے اکثر مناظر و مظاہر اس کی سمجھ میں نہ آئے تھے اور اب بھی یہی حال ہے، مگر فرق یہ ہے کہ پہلے وہ زیادہ سمجھنے کی کوشش بھی نہ کرتا تھا اور جو بات سمجھ میں نہ آتی تھی اسے کسی دوسری قوت غیر معلومہ سے منسوب کر دیتا تھا (اور یہی بنیاد تھی مذہب کی) لیکن اب چونکہ بہت سے حجابات دور ہو چکے ہیں، اس لئے وہ "عدم علم" کو کوئی اضطراری و فطری چیز نہیں سمجھتا اور کوشش کرتا ہے کہ وہ ہر بات کی حقیقت تک پہونچ جائے، الغرض وہ دور جب عقل کسی حجاب سے ٹکرا کر مذہب کی پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی تھی، بڑی حد تک ختم ہو چکا ہے اور اب مذہب و عقل کی جنگ ایسے دو فریق کی جنگ ہے جس میں ایک جدید آلات حرب سے آراستہ ہے اور دوسرا صرف روحانی عزم و ارادہ کے بھروسہ پر لڑنا چاہتا ہے - مذہب کے باب میں میرے سامنے ہمیشہ یہ سوال آیا کہ اگر اس کا تعلق اخلاقیات یا روحانیات سے ہے (جیسا کہ کہا جاتا ہے) تو اس کا مقصود دنیا میں صرف امن و سکون کی اشاعت ہونا چاہئے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حقیقت اس کے خلاف ہے - اس لئے اب دو ہی صورتیں ہیں یعنی اگر مذہب کوئی خدائی یا الہامی چیز ہی تو ہم اسکا صحیح استعمال نہیں کر رہے ہیں اور اگر وہ خود انسان کی پیدا کی ہوئی چیز ہے تو اب اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے - یقیناً مذہب ایک مجبور و بیکس انسان کے لئے بڑا سہارا اور سکون ہے، لیکن کوئی وجہ نہیں کہ وہ ساری دُنیا کے انسانوں کے لئے ایسا ثابت نہ ہو - حالانکہ صورت اسکے بالکل خلاف ہے - مذہب کا تخیل اگر صرف یہ قرار دیا جائے کہ تمام انسان خدا کے بندے ہیں اور وہی سب کا مالک ہے، تو پھر وہ مذاہب جو صرف معتقدات اور تعبیرات کی بنا پر دوسرے مذاہب والوں کو گمراہ اور دوزخی سمجھتے ہیں، سوسائٹی کے لئے مفید ثابت نہ ہوں گے اور عقلیت پسندوں کا ہدف قرار پائیں گے - خدا کا بلند ترین تصور جو اسوقت تک قایم کیا گیا ہے وہ اسکے بے نیاز اور قادر مطلق ہونے کا ہے - لیکن عقاید کی دنیا میں یہ تصور بالکل بیجا ہے - خدا کے بے نیاز ہونے کے معنے یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتی اور یہیں سے مذاہب کا تمام مابعد الطبیعاتی ڈھچر اور حشر و نشر ختم ہو جاتا ہے - اخروی عذاب و ثواب کو اعمال دنیا کا لازمی نتیجہ قرار دینا، گویا یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا متاثر ہو سکتا ہے، حالانکہ یہ اس کی شان بے نیازی کے منافی ہے - اسی طرح یہ سمجھنا کہ وہ ہم سے خوش یا ناخوش ہو کر اس دنیا میں ہمیں کامیاب و محروم کر سکتا ہے، اس تصور کے خلاف ہے - اب قادر مطلق ہونے کے لیجئے، تو یہ عقیدہ اور زیادہ رواداری اور سالمت چاہتا ہے - کیونکہ اس صورت میں ہمیں یہ کہنے کا حق باقی ہی نہیں رہتا کہ جو کچھ ہم سمجھتے ہیں وہی صحیح ہے اور دوسرے غلطی پر ہیں - بہرحال مذہب کی صحیح روح میری رائے میں یہی ہونا چاہئے کہ وہ تمام افراد انسانی کو ایک رشتہ سے وابستہ کر دے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اختلاف عقاید کو ہم بالکل ذاتی و انفرادی چیز خیال کریں - وہ زمانہ جب مذہب کی مدد سے صرف قبایلی یا قومی اغراض پورے کئے جاتے تھے گزر گیا ہے، اب اس میں آفاقیت پیدا ہونا چاہئے اسے ایک کائناتی چیز ہونا چاہئے اور اس کی صورت صرف یہ ہے کہ مذہب کا مفہوم محض "انسانیت پرستی" قرار دیا جائے - اگر خدا کو پوجتے پوجتے ہم آپس میں لڑنے لگیں تو اس سے زیادہ خدا کی توہین کیا ہو سکتی ہے؟

مطبوعات موصولہ

فن شاعری ارسطو کی مشہور کتاب بوطیقا (Poetics) کا ترجمہ ہے۔ جناب عزیز احمد صاحب بی۔ اے استاذ انگریزی جامعہ عثمانیہ کے قلم سے ـــــ ارسطو کی یہ کتاب غالباً دنیا کی سب سے پہلی کتاب ہے جس میں فن شاعری پر علمی انتقادی گفتگو کی گئی ہے۔ اس کتاب کے پانچ حصے ہیں، پہلے حصہ میں شاعری پر ایک عمومی تبصرہ کیا گیا ہے، دوسرے میں ٹریجڈی پر گفتگو کی گئی ہے، تیسرے میں رزمیہ شاعری پر، چوتھا نقادوں کے اعتراضات اور ان کے جواب دینے کے اصول سے متعلق ہے اور پانچویں میں یہ بتایا گیا ہے کہ ٹریجڈی رزمیہ شاعری پر فوقیت رکھتی ہے۔

ابتدا میں فاضل مترجم نے ایک مقدمہ کے ذریعہ سے اس کتاب کی اہمیت اور اس کے اصول نقد کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور اخیر میں اشارات و تلمیحات کا ایک باب اضافہ کرکے ترجمہ کو بہت زیادہ مفید بنا دیا ہے۔

انجمن ترقی اردو نے اس کتاب کو شایع کرکے فن نقد کی بڑی خدمت انجام دی ہے اور وہ حضرات جو اس فن کا اصولی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کتاب سے استفادہ ناگزیر ہے۔ قیمت عہ ۔ ملنے کا پتہ :- دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔

علم الاقوام ڈاکٹر بیرن عمر رالف ایہرن فیلس، کی تصنیف کا ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے اس نام سے کیا ہے۔ "علم الاقوام" جتنا دلچسپ علم ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ دلچسپ اس لئے کہ اس میں خود انسان اپنی جستجو کرتا ہے اور مشکل اس لئے کہ تمام دنیا میں پھیلے ہوئے انسانوں، اور انکی تہذیبوں کا کسی ایک مرکز تک سراغ لگانا آسان کام نہیں۔ اس کے لئے انتہائی صبر، حد درجہ کاوش اور غیر معمولی فراست وسلیقہ کی ضرورت ہے۔ اصل کتاب کے متعلق اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ ایک زبردست ماہر "اقوامیات" کی کاوش کا نتیجہ ہے اور ترجمہ کی خوبی وصحت کے لئے ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا نام کافی ضمانت ہے۔

یہ کتاب دو جلدوں میں انجمن ترقی اردو دہلی نے شایع کی ہے۔ پہلی جلد کی قیمت عہ ہے اور دوسری جلد کی عہ۔

ہماری غذا ترجمہ ہے رابرٹ لیکرسین کی کتاب کا جو مسئلہ غذا میں استنادی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ انتخاب غذا کے اصول کیا ہیں اور اس کا انتخاب کیونکر کرنا چاہئے۔ آجکل انسانی صحت کا انحصار زیادہ تر "حیاتین" پر سمجھا جاتا ہے اور شاید یہی وہ چیز ہے جس سے ہندوستانی عام طور پر ناواقف ہیں۔

چونکہ قومی ترقی کے مسایل میں مسئلہ صحت سب سے مقدم سمجھا جاتا ہے اس لئے اس وقت جبکہ ہندوستان نے بھی ترقی کی طرف قدم اٹھایا ہے ضروری ہے کہ "اصول غذا" کی طرف لوگوں کو متوجہ کرے اور اس کی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ اس قسم کی کتابیں پبلک کے سامنے کثرت سے پیش کی جائیں۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ انجمن ترقی اردو ہند نے اپنے سلسلۂ مطبوعات میں اس کو بھی جگہ دی اور ایک اچھی کتاب اردو داں پبلک کے سامنے پیش کی۔ ترجمہ سید مبارز الدین احمد رفعت نے کیا ہے اور ڈاکٹر غلام دستگیر صاحب نے نظر ثانی کی ہے۔ قیمت عہ

انشاء داغ مجموعہ ہے نواب مرزا داغ کے خطوط کا جسے جناب احسن مارہروی (مرحوم) نے مرتب کیا تھا۔ یہ مجموعہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں امراء و رؤسا کے نام کے خطوط ہیں۔ دوسرے حصہ میں اعزہ واحباب کے نام کے اور تیسرے حصہ میں شاگردوں کے نام کے خطوط یکجا کر دئے گئے ہیں ان خطوں میں محض انشاء کے لحاظ سے تو کوئی خاص بات نہیں، لیکن تاریخی حیثیت سے یہ بڑے کام کی چیز ہیں۔ ضرورت تھی کہ داغ ایسے شاعر کے خطوط کا مجموعہ شایع کیا جاتا۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ انجمن ترقی اردو ہند دہلی۔

حیوانی دنیا کے عجائبات

فن تاریخ میں نیچرل ہسٹری کا شعبہ غالباً سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ مغربی زبانوں میں تو اس فن پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اُردو میں ان کی بہت کمی تھی۔ جناب عبدالبصیر خانصاحب (مسلم یونیورسٹی) نے یہ کتاب لکھ کر بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ جابجا تصاویر و نقوش سے اس کی اہمیت و دلچسپی اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ قیمت عہ ر ملنے کا پتہ :- انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی۔

دیوان جوشش

محمد روشن جوشش، عظیم آباد کے مشہور شعراء میں تھے۔ ان کے باپ کا نام جسونت ناگر تھا جو علی وردی خاں کے ممتاز سرداران قوم میں سے تھے۔ قریب قریب تمام تذکروں میں ان کا ذکر نظر آتا ہے، لیکن دیوان اس وقت تک شایع نہ ہوا تھا۔ اب انجمن ترقی اُردو نے اس کمی کو پورا کیا۔

قاضی عبدالودود صاحب نے اس کو مرتب کیا ہے اور ابتدا میں ایک مقدمہ کے ذریعہ سے تمام وہ معلومات پیش کر دی ہیں جو ایک مقدمہ نگار کو پیش کرنا چاہیئے۔ کلام میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ زیادہ تر سودا کی تقلید پائی جاتی ہے اور وہ بھی ناقص۔ قیمت عہ ہے۔

ہماری قومی زبان

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو، اُردو زبان کے مشہور حامی ہیں اور انھوں نے جب کبھی کسی جلسہ میں اس موضوع پر تقریر کی ہے، صاف صاف اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، اس رسالہ میں انھیں کے خیالات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

قیمت ۸ ر - ملنے کا پتہ انجمن ترقی اُردو دہلی۔

محمدؐ

ترجمہ ہے توفیق الحکم مصری کی کتاب کا جناب ملیح آبادی کے قلم سے! سیرت نبوی پر اسوقت تک بکثرت کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن ضرورت ہے کہ زمانہ کے رجحانات کو دیکھتے ہوئے ان کے اسلوب کو بدلا جائے۔ چنانچہ یہ کتاب بالکل اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔

اس میں ولادت سے لیکر رحلت نبوی کے تمام اہم واقعات ڈرامہ کی صورت سے پیش کئے گئے ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ صرف مستند واقعات لئے جائیں کتاب نہایت دلچسپ ہے۔ ترجمہ کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے۔ ملیح آبادی کی نسبت اس کے حسن و صحت کے لئے کافی ضمانت ہے۔

قیمت عہ ملنے کا پتہ :- دفتر روزنامہ ہند کلکتہ۔

ترکی افسانے

ترجمہ ہے چار ترکی افسانوں کا جو وہاں کے مسلم الثبوت فسانہ نگاروں کے لکھے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے ترکی انشاء کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ترکوں کی "انشاء عالیہ" کتنی بلند چیز ہے۔ ملیح آبادی صاحب نے ان ترجموں کو اُردو میں منتقل کیا ہے اور اصل زبان کی تمام خصوصیات کو قایم رکھا ہے۔ قیمت عہ ر ملنے کا پتہ :- دفتر روزنامہ ہند - کلکتہ

نورس

جناب مسعود اختر جمال کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جمال ایک نوجوان شاعر ہیں اور جب تک میں ان سے ملا نہ تھا ان کو عورت ہی سمجھتا تھا۔ اگر تخلص کا اثر کسی کے کلام پر پڑ سکتا ہے تو میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جمال کا کلام واقعی جمیل ہے۔

اس مجموعہ میں مذہبی، قومی، ادبی ہر طرح کی نظمیں پائی جاتی ہیں اور ہر نظم میں کوئی نہ کوئی بات ایسی پائی جاتی ہے جو ہمارے فکر و تخیل کو چونکا دیتی ہے یا مسرور بنا دیتی ہے، قدامت کا گھنونا پن کہیں نہیں ہے۔ بہرحال یہ ایک ذہین نوجوان کی دلچسپ نظمیں ہیں اور ترقی پسند لٹریچر میں یہ مجموعہ یقیناً ایک مفید اضافہ ہے۔ قیمت غیر مجلد عہ ر - ملنے کا پتہ :- مکتبۂ ادبستان بنارس۔

۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں

حلقۂ ارباب ذوق لاہور نے اس مجموعہ میں ۲۵ نظمیں آج کل کے ترقی پسند نوجوانوں کی جمع کر دی ہیں۔ ابتدا میں ہلکا سا تبصرہ بھی شامل ہے۔

کشمکش نائی

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد کی یہ دوسری کتاب ہے۔ یہ کتاب "ادبیات اطفال" کے سلسلہ کی چیز ہے اور خوب ہے۔ اس سلسلہ میں قصے کہانیوں کے ذریعہ سے بچوں کو کام کی باتیں بتانے والی کتابیں شایع کیجاتی ہیں۔ اس کتاب کی قیمت ۱۰ ہے اور ملنے کا پتہ :- سب رس کتاب گھر حیدرآباد (دکن)

گارساں دتاسی

اس کتاب میں پروفیسر ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے بتایا ہے کہ گارساں دتاسی اور اس کے بعض ہمعصر مستشرقین نے اُردو کی کتنی بڑی خدمتیں انجام دی ہیں۔ یہ کتاب نقادوں اور تذکرہ نویسوں کے لئے بڑے کام کی چیز ہے۔ قیمت عہ ر -

ملنے کا پتہ :- سب رس کتاب گھر۔ حیدرآباد (دکن)

گلِ تریاک[1]

(ابن العربی کی ایک نظم کا آزاد ترجمہ بہ واسطۂ انگریزی)

میں نے اپنے بچپن میں، ایک نواب صاحب کو چانڈو پیتے دیکھا تھا۔ تاریک کوٹھری، نہایت کثیف تکیہ، ایک چراغ روشن۔ ایک شخص نے افیون کا قوام لوہے کی تیلی سے نے کی چھوچھی میں جو نے کی وسط میں ہوتی تھی لگایا۔ ایک شخص کروٹ سے لیٹا، دوسرا، دوسرا اُسکے کولے پر سر رکھ کر دراز ہوا۔ چھوچھی کو چراغ کی لَو سے ملایا، دم لگایا، ادھر ایک شعلہ فروزاں ہوا اُدھر دم لگانے والے کی آنکھیں پلٹ گئیں۔ اور بوٹنے لگا دوسرا ہنڑ بڑا کے اُٹھا اور اسی عمل کا اعادہ ہوا۔ اس شعلے کو یہ لوگ "گل تریاک" کہتے تھے۔ اب نظم کے آخری بند پر غور کیجیے۔ کلی کا جلکر شاداب و شگفتہ ہونا، تنہا اور خنک خاموشی میں گلِ تریاک کا کھلنا۔ تشنگی، مدہوشی معلوم ہوتا ہے ابن العربی کے زمانہ میں عربوں میں چانڈو کا رواج تھا۔ "اثر"

سیمابی ہوا میں ہانپتے پودے دھوپ کے گھونٹ چڑھاتے ہیں — شدت وہ عطش کی ہے لیکن، اس پر بھی ہانپتے جاتے ہیں

غش کھائے گلاب کے رس کو چوس رہی ہے سنہری اک تتلی — نازک نازک، سندر سندر، چھوٹی مونڈی، دُبلی پتلی

اور ہونٹ ترے سوتے میں ادھر ہیں نیم تبسم آلودہ — اے کاش کبھی دیکھوں میں انھیں پیغام سے اپنے آسودہ

جنبش نہ ہو یوہیں سوتی رہ، اے نیند کی ماتی متوالی

اور ہوش سبھوں کے کھوتی رہ، اے نیند کی ماتی متوالی

باریک سنہری نقاب تو اپنے روئے زیبا سے نہ ہٹا — مشتاق ہیں آنکھیں ذروں کی اور تاک میں ہے تپتا صحرا

یہ تیرے خزانۂ زر کی نگہباں ہے اور اُسکو چھپائے ہے — وہ پردا ہے جو چشم زخم سے حُسن کو تیرے بچائے ہے

سورج کی دمکتی لپٹ جو ہے شفاف تن بلوریں میں — (محلول ستارے یا موتی مینائے مئی انگوریں میں)

وہ سہم کے ہو نہ فرار کہیں، اے نیند کی ماتی متوالی

اور فتنے نہ ہوں بیدار کہیں، اے نیند کی ماتی متوالی

---

[1] چانڈو باز "گلِ تریاک" اس شعلے کو کہتے ہیں جو چانڈو کا دم لگانے پر نے سے بلند ہوتا ہے۔ دم لگانے کو یہ لوگ "چھینٹا لینا" کہتے ہیں۔

مدو جزر موج دریا سینے کے اُبھرنے میں ڈوبنے میں
تھکتی ہی نہیں تکنے سے جنھیں نوخیز حبابوں کی آنکھیں

اُف بروں کی ایسی سفیدی مگر دوڑے جو لہو میں سانس کے ساتھ
ساحل کا راز تشنہ لبی، اس درجہ قریب اور آئیں نہ ہاتھ

جیسے ہو دہن میں موج کے کف، زریں زریں تاباں تاباں
تند اور سرکش، تاہم دلکش، برخود نازاں برخود پیچاں

کروٹ نہ بدل، کروٹ نہ بدل، اے نیند کی ماتی متوالی
ہے ہے نہ مچل، ہے ہے نہ مچل، اے نیند کی ماتی متوالی

پھر کیوں نہ ہو چشمہ اشک فشاں اور توڑے نہ دم پیلی تتلی
منظر ہو جب ایسا تاب شکن، کیوں غیر نہ ہو حالت دل کی

جب ایسی شدید محبت ہو، کثرت سے گلابی میخواری
خوابیدہ پیکر رعنائی، اپنی مجبوری، ناچاری

کیوں لپٹیں نہ جلتی آنکھیں مری چھاتی کے سرخ انگوروں سے
کیوں رحم کی رکھوں آس نہ میں ہشیار نما مخموروں سے

جلتی ہے جو چھاتی جلنے دے، اے نیند کی ماتی متوالی
جو کچھ بھی ہو آنکھس ملنے دے، اے نیند کی ماتی متوالی

جل جائے تو میرے دل کی کلی شاداب و شگفتہ ہو جائے
ہو خاک اور پھر یہ خاک اُڑ کر اک کیف ابد میں کھو جائے

مَس ہو کے گل و صندل سے مہکتے جسم کی تیرے خوشبو سے
قسمت پہ نہ کیوں وہ ناز کرے جس کو ہوں میسر یہ "بوسے"

پروانے پہ گزرے جو گزرے شعلے سے مبارز کوشی میں
مانند گلِ تریاک کھلے تنہا و خنک خاموشی میں

اس تشنگی و مدہوشی میں، اے نیند کی ماتی متوالی
حسرت کشیٔ ہمدوشی میں، اے نیند کی ماتی متوالی

اثر لکھنوی

ایک شاعرانہ لمحہ

جسمِ سیمیں کی یہ لرزش ۔ یہ محبت کا سلام
مسکراتی ہوئی آنکھوں میں وفا کا پیغام
اُف یہ لغزیدہ قدم ۔ ہائے یہ بے ربط کلام
عشق نے بخشدیا آج تجھے حسنِ دوام
جو ادا ہے تری مینوش ہوئی جاتی ہے

حشر کیا اے دلِ رنجور ہوا جاتا ہے
حسن اک عالمِ مجبور ہوا جاتا ہے
کیف وہ ہے کہ جہاں چور ہوا جاتا ہے
ہر نفس بے خود و مخمور ہوا جاتا ہے
ہر نظر میکدہ بردوش ہوئی جاتی ہے

دل میں شورش ہے کہ برپا ہے سکوں کیا کہئے
شعلۂ زیست میں یہ سوزِ دروں کیا کہئے
کارگر ہے مری نظروں کا فسوں کیا کہئے
تیری آنکھوں میں یہ اندازِ جنوں کیا کہئے
آرزو محشرِ خاموش ہوئی جاتی ہے

ہائے کس درجہ حسیں رات ہے۔ کیا لمحہ ہے
تیری ہر سانس میں اک جذبۂ وارفتہ ہے
کیا ترنم ہے۔ یہ کیا سحر ہے۔ کیا نغمہ ہے
کتنا رس ہے تری آواز میں کیا لہجہ ہے
دل کی دنیا ہمہ تن گوش ہوئی جاتی ہے

یہ نگاہوں میں تری حسرتِ پرواز ہے کیا
رخ پہ یہ برہمی زلف کا انداز ہے کیا
ہائے انجامِ تمنّا کا یہ آغاز ہے کیا
رہ گیا آکے جو لب تک وہ حسیں راز ہے کیا
بات کیا ہے جو فراموش ہوئی جاتی ہے

چشمِ غمناک میں یہ جذب یہ تاثیر ہے کیوں
میرا غم آج ترا عالمِ تصویر ہے کیوں
اُلجھی اُلجھی سی مرے خواب کی تعبیر ہے کیوں
شمعِ احساس یہ گم کردۂ تنویر ہے کیوں
عقل خود رفتہ و مدہوش ہوئی جاتی ہے

یہ مرادوں کا شبستاں ۔ یہ خیالوں کا ہجوم
تیری پلکوں پہ لرزتے ہوئے تابندہ نجوم
اُف یہ ہیجانِ تمنّا ۔ یہ نگاہِ معصوم
یہی دنیا جو تھی آغوشِ وفا سے محروم
آج آغوش در آغوش ہوئی جائی ہے

مسعود اختر جمالؔ

حسین دوشیزہ

دوشیزگیِ حُسن کا اللہ رے! آغاز — بہکی ہوئی رفتار، یہ کھوئے ہوئے انداز
ہر بات میں سہمی ہوئی لے ناز و ادا کی — ہر سانس میں دبتی ہوئی جذبات کی آواز
گھبرائی ہوئی چال کا یہ حال ہے جیسے — اک طائرِ نوخیز کی جھجکی ہوئی پرواز
عارض سے نکلتی ہوئی اک آتشِ بے رنگ — ہونٹوں پہ لرزتا ہوا اک نغمۂ بے ساز
رُخسار سے تھم تھم کے یہ ہٹتے ہوئے گیسو — ہو شام کو جیسے کسی میخانہ کا دربار
مدہوش بنا کر ہی یہ ڈھاتا ہے قیامت — رفتار کا جادو، کبھی گفتار کا اعجاز

آنکھوں کو جھکائے ہوئے مبہم سا اشارہ
سو جان سے ہو جس پہ فدا صنعتِ ایجاز

آنکھیں وہ حیا کوش کہ نظارے سے بیزار — عارض ہیں وہ نازک کہ پسینہ سے گرانبار
اونچی ہے ستاروں سے بھی اخلاق کی رفعت — پھولوں سے بھی بڑھکر کہیں معصوم کردار
آنکھوں کا وہ انداز تغافل نہ توجہ — گردن کا وہ خم، جس میں نہ انکار نہ اقرار
وہ سادگیِ حُسن کی افسانہ نگاری — سانچے میں اداؤں کے وہ ڈھلتے ہوئے اشعار
آگاہ نہیں ہے ابھی دُنیا کی ہوا سے — اپنوں ہی سے واقف ہے نہ غیروں سے خبردار
اک آتشِ خاموش ہے کہتے ہیں یہ تیور — طوفان ہے طوفان بتاتے ہیں یہ آثار

اک صبح کہ جس میں نہ اندھیرا نہ اُجالا
اک کشتیِ جذبات نہ اِس پار نہ اُس پار

شانوں پہ دوپٹہ کا یہ اُڑتا ہوا آنچل — ماحول ہے بے چین، ہواؤں میں ہے ہل چل
زلفوں کی گھنی چھاؤں میں یہ تابشِ رُخسار — آتشکدۂ حُسن پہ چھائے ہوئے بادل
اللہ رے! یہ ساقِ بلوریں دمِ رفتار — جنبش میں ہو جس طرح مئے ناب کی بوتل
چھایا ہوا اک بار ہے احساسِ حیا کا — تیور بھی گرانبار ہیں، پلکیں بھی ہیں بوجھل
کُرتہ کے گریبان پہ کچھ پان کے دھبے — آنکھوں میں پسینہ سے ہے پھیلا ہوا کاجل
گردن میں ہے مالا نہ کلائی میں ہے کنگن — اور پاؤں میں پازیب، نہ گھنگرو ہیں نہ چھاگل

جس سے کوئی کھیلا نہ ہو وہ لعبتِ رنگیں
شبنم سے بھی ہو پاک وہ اُٹھتی ہوئی کونپل

وہ گیت مُغنّی جسے دُہرا نہ سکا ہو — وہ ساز جسے چھو نہ سکی جنبشِ مضراب
وہ بُت کہ نہ اک پھول چڑھایا ہو کسی نے — جس میں کوئی سجدہ نہ ہوا وہ خمِ محراب
کچھ تجربہ دُنیا کا نہ آگاہیِ ماحول — بیگانۂ دستور ہے ناواقفِ آداب

کیا چیز ہے دُنیا اسے معلوم نہیں ہے
ظالم ہے یہ ظالم، ابھی مظلوم نہیں ہے

ماہر القادری